ربیع الثّانی ۱۴۴۵ھ
نومبر ۲۰۲۳ء

ماہنامہ میثاق لاہور

یکے از مطبوعات
تنظیمِ اسلامی
بانی: ڈاکٹر اسرار احمدؒ

علّامہ اقبال اور کتابِ زندہ

سالانہ اجتماع کے مقاصد اور ان کے حصول کا طریقہ

بانیٔ تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمدؒ

داعی رجوع الی القرآن بانی تنظیم اسلامی
محترم ڈاکٹر اسرار احمد رحمۃ اللہ علیہ
کے شہرۂ آفاق دورۂ ترجمہ قرآن پر مشتمل

بیانُ القرآن
ترجمہ و مختصر تفسیر

اب دو انداز سے دستیاب ہے

• خوبصورت ٹائٹل • سفید کاغذ • معیاری طباعت
1 2935 صفحات پر مشتمل، سات جلدوں میں
(الگ الگ جلدیں بھی دستیاب ہیں!)
مکمل سیٹ کی قیمت: 6000 روپے

2 متعدد اضافی خوبیوں کا حامل، طبع جدید
• قرآنی رسم الخط • تفسیری سائز • عمدہ سفید کاغذ • مضبوط مراکو جلد
2560 صفحات پر مشتمل، چار جلدوں میں
مکمل سیٹ کی قیمت: 9600 روپے

مکتبہ خُدّام القرآن لاہور
K-36، ماڈل ٹاؤن لاہور، فون 3-35869501(042)

وَاذۡکُرُوۡا نِعۡمَۃَ اللّٰہِ عَلَیۡکُمۡ وَمِیۡثَاقَہُ الَّذِیۡ وَاثَقَکُمۡ بِہٖۤ ۙ اِذۡ قُلۡتُمۡ سَمِعۡنَا وَاَطَعۡنَا ۫ (المائدۃ:۷)

ترجمہ: اور اپنے اوپر اللہ کے فضل اور اس کے میثاق کو یاد رکھو جو اس نے تم سے لیا جبکہ تم نے اقرار کیا کہ ہم نے مانا اور اطاعت کی!

ماہنامہ میثاق لاہور

اجرائے ثانی

ڈاکٹر اسرار احمد رحمۃ اللہ علیہ

جلد : 72

شمارہ : 11

ربیع الثّانی 1445ھ

نومبر 2023ء

فی شمارہ : 50روپے

سالانہ زرِتعاون: 500 روپے

اس شمارے کی قیمت: 100روپے

مُدیر: حافظ عاکف سعید

مجلس ادارت: ایوب بیگ مرزا' خورشید انجم

نائب مُدیر: حافظ خالد محمود خضر

ادارتی معاون: حافظ محمد زاہد' محمد خلیق

مکتبہ خدام القرآن لاہور

مقام اشاعت: 36۔ کے ماڈل ٹاؤن' لاہور 54700' فون: 3-35869501

فیکس: 35834000' ای میل: maktaba@tanzeem.org

ترسیلِ زر: مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

رابطہ برائے ادارتی امور: (042)38939321

publications@tanzeem.org

ویب سائٹ: www.tanzeem.org

مرکزی دفتر تنظیم اسلامی: ''دارالاسلام'' ملتان روڈ چوہنگ لاہور

(پوسٹل کوڈ 53800) فون: (042)35473375-78

پبلشر: ناظم مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

طابع: رشید احمد چوہدری مطبع: مکتبہ جدید پریس (پرائیویٹ) لمیٹڈ

مشمولات

عرضِ احوال ... 5
جنگ کے سائے میں تنظیم اسلامی کا سالانہ اجتماع — ایوب بیگ مرزا

بیانُ القرآن ... 9
سورۃ النّبا۔ سورۃ النّازعات — ڈاکٹر اسرار احمدؒ

تیز ترک گامزن ... 27
سالانہ اجتماع کے مقاصد اور ان کے حصول کا طریقہ — ڈاکٹر اسرار احمدؒ

اقبالیات ... 35
علامہ اقبال اور کتابِ زندہ — ڈاکٹر اسرار احمدؒ

تحریک اور کارکن ... 43
ضُعفِ ارادہ — سیّد ابوالاعلیٰ مودودیؒ

دعوت وعزیمت ... 53
فریضۂ اقامتِ دین اور رفیقِ تنظیم — عبدالرؤف

فرائضِ دینی ... 59
تصورِ اقامتِ دین: چند اعتراضات کا جائزہ — سیّد سعادت اللہ حسینی

آغازِ سفر ... 79
روداد تاسیسی اجتماع — مرتب: شیخ جمیل الرحمٰن

ظروف واحوال ... 104
ریاست اسرائیل: قریب الموت — مترجم: ڈاکٹر ساجد خاکوانی

قضیۂ فلسطین ... 107
اسرائیل' پاکستان اور ذوالفقار علی بھٹو — مترجم: رضی الدین سید

تاریخ فلسطین ... 111
بیت المقدس کا مختصر تاریخی خاکہ — سعد عبداللہ

انوارِ ھدایت ... 119
یَا حَسۡرَتَا! — پروفیسر محمد یونس جنجوعہ

حسنِ معاشرت ... 125
خوشامد: حسنِ معاشرت کا بدنما داغ — راحیل گوہر صدیقی

حقیقتِ دین ... 133
حقوق اللہ اور حقوق العباد کا جائزہ — ممتاز ہاشمی

توضیح وتنقیح ... 137
مکشوفاتِ بگوی — مکرم محمود

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ○

جنگ کے سائے میں
تنظیمِ اسلامی کا سالانہ اجتماع

ایوب بیگ مرزا

تنظیمِ اسلامی کا سالانہ اجتماع اس مرتبہ ان حالات میں منعقد ہو رہا ہے کہ فلسطینی مسلمانوں پر قیامت ٹوٹ چکی ہے۔ کہنا تو ہمیں یہ چاہیے تھا کہ اُمتِ مُسلمہ پر قیامت ٹوٹ پڑی ہے' لیکن اُمتِ مُسلمہ کہیں دکھائی دے رہی ہوتی تو ہم اُس کا ذکر ضرور کرتے۔ دنیا بھر کے مسلمان تو بعد کی بات ہے' ہمیں تو عرب بھی متحد نظر نہیں آتے۔ یو اے ای کا رخ کچھ اور ہی نظر آ رہا ہے۔ اُس کی ایک خاتون وزیر نے کھلم کھلا حماس پر تنقید کی ہے۔ جذباتیت سے ہٹ کر اگر منطق کو اس رویے کی بنیاد بنا کر غور و فکر کریں تو مسلمانوں کی یہ ٹوٹ پھوٹ دو اور دو چار کی طرح واضح نظر آتی ہے۔ دلیل اس کی یہ ہے کہ وہ ہستی جسے مسلمان نظریاتی طور پر اور زبانی طور پر کائنات کی عظیم ترین ہستی قرار دیتے ہیں اور جن کے بارے میں ہمارا دعویٰ ہے کہ ان کی نبوت و رسالت اختتامی ہی نہیں تکمیلی بھی ہے اور دائمی بھی ہے یعنی حضرت محمد ﷺ' اُنہوں نے تو مسلمانوں کو ایک لڑی میں پرو کر ایک ہی جسد قرار دیا تھا۔ اس سے وہ اُمت وجود میں آئی جو اُمتِ مُسلمہ کہلائی' جس کے ایک حصے کی تکلیف دوسرے حصے کو بھی محسوس ہوتی۔ رفتہ رفتہ مسلمانوں نے اُمت کے بانی اور حقیقی رہنما سے اپنے تعلق کو کمزور کر لیا۔ پھر علاقائی مفادات اور اقتدار کی ہوس نے مسلمانوں کو بُری طرح بکھیر دیا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ ''اُمتِ مُسلمہ'' کی اصطلاح تقریروں اور تحریروں ہی تک محدود ہو کر رہ گئی جبکہ اُس کا وجود عملاً ختم ہو گیا۔

یہی وجہ ہے کہ آج یہودی نام کی وہ قوم جسے اللہ تبارک و تعالیٰ مسلمانوں کا بدترین دشمن قرار دیتا ہے' مسلمان مردوں اور عورتوں ہی کے نہیں بلکہ معصوم بچوں کے اجسام کو بھی پرزے پرزے کر کے ہوا میں اچھال رہی ہے۔ ایسے میں مسلمان عملی طور پر کچھ کرنے کے بجائے بھانت بھانت کی بولیاں بول رہے ہیں یا زیادہ سے زیادہ اسرائیل کی زبانی مذمت کر رہے ہیں۔ فلسطینیوں کو محض جھوٹی سچی تسلیاں

دے رہے ہیں۔ ان میں اتنی جرأت نہیں کہ اسرائیل کے خلاف ایسے اقدامات کریں جس سے اسے یا اُس کے سرپرست امریکہ اور یورپ کو سفارتی' معاشی اور تجارتی سطح پر کوئی نقصان پہنچے۔

اسرائیل کی نگاہِ بد اس وقت مسجد اقصیٰ پر مرکوز ہے جسے وہ زمین بوس کر کے تھرڈ ٹمپل قائم کرنا چاہتا ہے۔ جن عرب علاقوں پر قبضہ کر کے وہ اُنہیں گریٹر اسرائیل کا حصہ بنانا چاہتا ہے' وہاں کے عربوں کو صلح و صفائی اور امن و امان کا چکر دے کر اپنے جال میں پھنسا رہا ہے۔ عرب حکمرانوں کے قلوب و اذہان کو اقتدار اور دولت کے نشہ نے اس بُری طرح جکڑا ہوا ہے کہ وہ دشمن کے اصل وار کو سمجھ ہی نہیں پا رہے۔ حقیقت سے نظریں چرا کر وہ اس غلط فہمی میں مبتلا ہیں کہ اگر ہم امریکہ اور اسرائیل کے سامنے اچھے بچے بن کر رہیں گے تو ہمارا اقتدار قائم رہے گا اور عوام بھی امن و امان میں رہیں گے۔ سوال یہ ہے' اور یہ بڑا اہم سوال ہے جس کا جواب فیصلہ کن ثابت ہو سکتا ہے' کہ کیا اسرائیل عرب حکمرانوں کے اقتدار اور عرب عوام کے امن و امان کی خاطر اپنا گریٹر اسرائیل کا منصوبہ تج کر دے گا جو اُن کے مذہبی عقیدے کا جزو لاینفک ہے؟ کوئی نادان ہی اس کا جواب اثبات میں دے سکتا ہے۔ بہرحال ہم تو اُمتِ مُسلمہ پر رونا دھونا اور فلسطینیوں کی انتہائی مخدوش حالت پر اپنے رنج و غم کا اظہار ہی کر سکتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ مسلمانوں پر رحم فرمائے!

اب ہم تنظیم اسلامی کے سالانہ اجتماع کے حوالے سے رفقاء کے سامنے اپنی چند گزارشات رکھیں گے۔ اُمتِ مُسلمہ کے لیے اللہ تعالیٰ اور اُس کے آخری رسول ﷺ نے سال میں دو دن بطور عید مقرر کیے۔ یکم شوال کو عید الفطر سے موسوم کیا گیا اور دس ذوالحجہ کو عید الاضحیٰ کا نام دیا گیا۔ ان دونوں کے علاوہ کسی تیسرے دن کو عید قرار دینا یقیناً بدعت ہے' البتہ اگر محض لغوی حوالہ سے دیکھا جائے تو اس کا مطلب ہے: لوٹ کر آنے والا دن۔ اس میں خوشی اور اظہارِ مسرت کا عنصر بھی مضمر ہے۔ اُس ماہ مبارک کو پا لینا جسے اللہ ربّ العزت نے اپنا مہینہ کہا اور اُس کی ایک رات کو ہزار مہینوں سے افضل قرار دیا' اسی طرح ابوالانبیاء حضرت ابراہیم علیہ السلام کی عظیم سُنّت کو ادا کر لینا۔ اس سے بڑی خوش نصیبی کیا ہو گی کہ ایک مسلمان کی زندگی میں خوشیوں بھرے یہ دو تہوار لوٹ لوٹ کر آئیں۔ چنانچہ اردو زبان میں لفظ ''عید'' کو خوشی اور جشن کا مترادف قرار دیا گیا۔ اسی لیے کہا اور لکھا جاتا ہے کہ ''فلاں کی تو عید ہو گئی''۔ یہ عید ہر انسان کی اپنی سوچ' فکر' خواہشات اور ترجیحات کے مطابق ہوتی ہے۔ مثلاً اپنے کاروبار اور تجارت کو ترجیح اوّل دینے والے تاجر کا مال دُگنی چوگنی قیمت پر فروخت ہو جائے تو اُس کی عید ہو جاتی ہے۔ ایک سماجی کارکن جب رضا کارانہ طور پر کسی کی مدد کرتا ہے تو اُس کا دل خوشی سے

معمور ہو جاتا ہے۔ ایک سیاسی کارکن جب اپنے لیڈر کا جلسہ کامیابی سے منعقد کراتا ہے یا اپنے حلقہ سے اسمبلی کا ممبر بنواتا ہے تو خوشی سے پھولے نہیں سماتا‘ اس لیے کہ سیاست سے دلچسپی کے علاوہ اُس کے ذاتی مفادات بھی اس کامیابی سے وابستہ ہیں۔ گویا لغوی معنی قدرے مختلف ہونے کے باوجود اُردو زبان میں عید کا لفظ خوشی اور مسرت کا مترادف سمجھا جاتا ہے۔

اس تناظر میں دیکھا جائے تو کسی تحریک کا سالانہ اجتماع بھی کارکنوں کے لیے عید کی سی حیثیت رکھتا ہے۔ تنظیم اسلامی کے رفقاء رضائے الٰہی کے لیے اقامتِ دین کی جدّوجُہد میں ہم سفر اور ہم رکاب ہیں‘ لہٰذا ساتھیوں کی ایک بڑی تعداد دیکھ کر اُن کے ایمان کو جلا ملتی ہے۔ ملک کے کونے کونے اور بیرونِ ملک سے آئے ہوئے رفقاء کو اپنے فکری اور تحریکی بھائیوں سے مل بیٹھنے کا موقع میسر آتا ہے۔ اس باہمی رابطہ سے اخوت ومحبت کا جذبہ پیدا ہوتا ہے۔ تبادلۂ خیال سے فکر میں پختگی پیدا ہوتی ہے۔ دُنیوی اُمور اور معمول کی ذمہ داریوں سے بالکل الگ تھلگ ہو کر ایک پاکیزہ ماحول میں یہ موقع ملتا ہے کہ ماضی میں ہونے والی اپنی کوتاہیوں پر نگاہ ڈالیں‘ اللہ اور اس کے محبوب رسول ﷺ جن چیزوں کو ناپسند کرتے ہیں اُن سے ہجرت کا عہد کریں اور باقی ماندہ زندگی میں اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی غیر مشروط بندگی اور رسولِ کریم ﷺ کی پیروی کا عزم کریں۔

رفیقِ محترم! دنیا کے جھنجھٹ میں ان چیزوں پر غور کرنے کا موقع کہاں میسر آتا ہے۔ انسان صرف اتنی بات پر ہی غور کر لے کہ ۶۰ یا ۷۰ سالہ زندگی کو آسودہ اور خوش نما بنانے کے لیے اسے کولھو کا بیل بننا پڑتا ہے تو ابدی اور لامحدود زندگی کو خوش گوار بنانے کے لیے کس قدر محنت درکار ہوگی۔ کیا ہم مطلوبہ محنت کر رہے ہیں؟ اس سوال کی جواب دہی کے تصور ہی سے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔

رفیقِ محترم! یہ دینی ذمہ داریاں ایک مسلمان کو عام حالات میں ادا کرنا ہوتی ہیں۔ آج مملکت خداداد اسلامی جمہوریہ پاکستان کے حالات عام نہیں‘ خاص ہیں۔ محلاتی سازشوں نے بدترین سیاسی عدمِ استحکام پیدا کر دیا ہے۔ سودی معیشت‘ کرپشن اور آئی ایم ایف کے ساتھ معاہدوں نے ملکی معیشت کو تباہ و برباد کر دیا ہے۔ مہنگائی اور بے روزگاری کے باعث عوام میں سخت بے چینی اور اضطراب پایا جاتا ہے۔ پھر یہ کہ مقتدر قوتیں اپنا کھیل کھیلنے میں مصروف ہیں۔ گویا داخلی سطح پر ملک افتراق اور انتشار کی لپیٹ میں ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ مسلمانانِ پاکستان ایمان کے فقدان کی وجہ سے دُنیوی دولت‘ اقتدار اور قوت کے سامنے سجدہ ریز ہیں۔ اس پس منظر میں ایک انقلابی جماعت کے رفیق کی ذمہ داریاں دوچند ہو جاتی ہیں۔ اس وقت ہم ایک ایسی کشتی کے سوار ہیں جو خوفناک طوفانی

لہروں کی زد میں ہچکولے کھا رہی ہے۔ کچھ لوگ اس کے اندر تیشہ چلا رہے ہیں جبکہ خارجی طور پر امریکہ‘ بھارت اور اسرائیل کا ابلیسی اتحاد اسے ہر صورت غرق کرنے کے درپے ہے۔

رفقاءِ گرامی! اس کشتی کو حفاظت اور سلامتی سے کنارے لگانا ہماری قومی ہی نہیں‘ دینی ذمہ داری بھی ہے۔ مسلمانانِ پاکستان اس لحاظ سے خوش قسمت ہیں کہ اس ملک کو خوش حال اور مستحکم کرنے کی جدّوجُہد اور اُخروی نجات کے لیے دینی ذمہ داریاں ادا کرنا درحقیقت ایک ہی سمت میں محنت اور جان فشانی کا تقاضا کرتی ہیں۔ مراد یہ ہے کہ اگر یہاں اسلامی نظام نافذ ہو جائے تو پاکستان نہ صرف ناقابلِ تسخیر ہو سکتا ہے بلکہ سپر پاور آف دی ورلڈ بن کر بھی اُبھر سکتا ہے۔ جو لوگ اسے ایک اسلامی فلاحی ریاست بنانے میں کردار ادا کریں گے‘ وہ اللہ کی رضا پا کر امر ہو جائیں گے۔ وہ دنیا میں سرفراز ہوں گے جبکہ آخرت میں جنّت اُن کی منتظر ہوگی۔ بصورتِ دیگر‘ ایک سیکولر پاکستان میں ہم دلدل میں دھنستے چلے جائیں گے۔ مکڑی کی طرح ایسا جال بُن لیں گے جس میں خود ہی پھنس کر ہلاک ہو جائیں گے۔ خارجی صورتِ حال بالخصوص اپنے اردگرد کے منظر نامہ پر غور کیجیے۔ بھارت ہمارا ازلی دشمن ہے۔ کشمیر جسے ہم اپنی شہ رگ کہتے ہیں‘ اُس پر اُس نے اپنے پنجے گاڑے ہوئے ہیں۔ ہر دوسرے دن ہمارا پانی بند کرنے کی دھمکیاں دیتا رہتا ہے۔ مقبوضہ کشمیر میں ہمارے مسلمان بھائیوں پر ظلم وستم ڈھا رہا ہے۔ آزاد کشمیر کے حوالہ سے اپنے مذموم عزائم کا کھلے عام اعلان کر رہا ہے۔

رفقاء کو یہ بھی سمجھنا چاہیے کہ گریٹر اسرائیل اور غزہ میں جاری جنگ سے پاکستان کا کیا تعلق جڑتا ہے۔ گریٹر اسرائیل قائم کرنے کے آخری مرحلے میں جب اسرائیل فیصلہ کن جنگ شروع کرے گا تو وہ کسی صورت یہ رسک نہیں لے گا کہ کسی اسلامی ملک کے پاس ایٹمی ہتھیار ہوں‘ لہٰذا پاکستان کو خواہی نخواہی جنگ کا حصہ بننا پڑے گا۔ چنانچہ پاکستان اگر اپنے ایٹمی ہتھیار سرنڈر کرتا ہے تو بھارت پاکستان پر چڑھ دوڑنے میں کوئی وقت ضائع نہیں کرے گا۔ ہمیں سمجھنا چاہیے کہ امریکہ‘ بھارت اور اسرائیل ایک ایسے اتحاد میں بندھے ہوئے ہیں جس کا اصل ہدف مسلمانوں کو دنیا سے نیست ونابود کرنا ہے۔ اسرائیل مشرقِ وسطیٰ میں گریٹر اسرائیل کے راستے کی ہر رکاوٹ دور کرنے کے بعد اب ایٹمی پاکستان کو اپنے ہدف کے حوالے سے آخری رکاوٹ سمجھ رہا ہے۔ لہٰذا بھارت کے ساتھ مل کر وہ خوف ناک سازشیں کر رہا ہے۔ امریکہ جسے ہم اپنا آقا اور محافظ سمجھتے ہیں‘ اسرائیل کے سامنے بھیگی بلی بنا ہوا ہے اور آئے دن اپنے ناجائز مطالبات منوانے کے لیے ہمارا بازو مروڑتا رہتا ہے۔

(باقی صفحہ 146 پر)

دورۂ ترجمۂ قرآن

ڈاکٹر اسرار احمد

سُوْرَۃُ النَّبَا

آیات ۱ تا ۳۰

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ○

عَمَّ یَتَسَآءَلُوۡنَ ﴿١﴾ عَنِ النَّبَاِ الۡعَظِیۡمِ ﴿٢﴾ الَّذِیۡ ہُمۡ فِیۡہِ
مُخۡتَلِفُوۡنَ ﴿٣﴾ کَلَّا سَیَعۡلَمُوۡنَ ﴿٤﴾ ثُمَّ کَلَّا سَیَعۡلَمُوۡنَ ﴿٥﴾ اَلَمۡ
نَجۡعَلِ الۡاَرۡضَ مِہٰدًا ﴿٦﴾ وَّ الۡجِبَالَ اَوۡتَادًا ﴿٧﴾ وَّ خَلَقۡنٰکُمۡ
اَزۡوَاجًا ﴿٨﴾ وَّ جَعَلۡنَا نَوۡمَکُمۡ سُبَاتًا ﴿٩﴾ وَّ جَعَلۡنَا الَّیۡلَ لِبَاسًا ﴿١٠﴾ وَّ
جَعَلۡنَا النَّہَارَ مَعَاشًا ﴿١١﴾ وَّ بَنَیۡنَا فَوۡقَکُمۡ سَبۡعًا شِدَادًا ﴿١٢﴾ وَّ جَعَلۡنَا
سِرَاجًا وَّہَّاجًا ﴿١٣﴾ وَّ اَنۡزَلۡنَا مِنَ الۡمُعۡصِرٰتِ مَآءً ثَجَّاجًا ﴿١٤﴾
لِّنُخۡرِجَ بِہٖ حَبًّا وَّ نَبَاتًا ﴿١٥﴾ وَّ جَنّٰتٍ اَلۡفَافًا ﴿١٦﴾ اِنَّ یَوۡمَ الۡفَصۡلِ
کَانَ مِیۡقَاتًا ﴿١٧﴾ یَّوۡمَ یُنۡفَخُ فِی الصُّوۡرِ فَتَاۡتُوۡنَ اَفۡوَاجًا ﴿١٨﴾ وَّ
فُتِحَتِ السَّمَآءُ فَکَانَتۡ اَبۡوَابًا ﴿١٩﴾ وَّ سُیِّرَتِ الۡجِبَالُ فَکَانَتۡ
سَرَابًا ﴿٢٠﴾ اِنَّ جَہَنَّمَ کَانَتۡ مِرۡصَادًا ﴿٢١﴾ لِّلطّٰغِیۡنَ مَاٰبًا ﴿٢٢﴾ لّٰبِثِیۡنَ
فِیۡہَاۤ اَحۡقَابًا ﴿٢٣﴾ لَا یَذُوۡقُوۡنَ فِیۡہَا بَرۡدًا وَّ لَا شَرَابًا ﴿٢٤﴾ اِلَّا حَمِیۡمًا وَّ
غَسَّاقًا ﴿٢٥﴾ جَزَآءً وِّفَاقًا ﴿٢٦﴾ اِنَّہُمۡ کَانُوۡا لَا یَرۡجُوۡنَ حِسَابًا ﴿٢٧﴾ وَّ
کَذَّبُوۡا بِاٰیٰتِنَا کِذَّابًا ﴿٢٨﴾ وَ کُلَّ شَیۡءٍ اَحۡصَیۡنٰہُ کِتٰبًا ﴿٢٩﴾ فَذُوۡقُوۡا
فَلَنۡ نَّزِیۡدَکُمۡ اِلَّا عَذَابًا ﴿٣٠﴾

آیت ۱ ﴿عَمَّ یَتَسَآءَلُوۡنَ ۱﴾ ”کس چیز کے بارے میں یہ لوگ آپس میں پوچھ گچھ کر رہے ہیں؟“

یہ منظر کشی کا بہت خوبصورت انداز ہے۔ ان دو الفاظ میں گویا اس بے چینی اور ہلچل کی تصویر کھینچ دی گئی ہے جو اہلِ مکہ کے ہاں رسول اللہ ﷺ کی دعوت کے سبب پیدا ہو گئی تھی۔ جیسے ہر شخص کے ذہن میں ایک ہی سوال ہو کہ محمد (ﷺ) نے یہ کیا نئی بات کر دی ہے؟ یہ بھلا کیا بات ہوئی کہ ایک دن یہ دنیا ختم ہو جائے گی! پھر قیامت برپا ہو گی! تمام انسانوں کو پھر سے زندہ کر لیا جائے گا! ہر انسان سے اس کے ایک ایک عمل کا حساب ہوگا! وہاں کوئی کسی کا پُرسانِ حال اور مددگار نہیں ہوگا! بھلا یہ سب کیسے ہو سکتا ہے؟ مرنے کے بعد سب کا پھر سے زندہ ہو جانا؟ اتنے انسانوں کا حساب کتاب؟ ایک ایک عمل کا محاسبہ؟ نہیں، نہیں عقل نہیں مانتی! گویا مکہ کے ہر گھر میں یہی چہ میگوئیاں ہو رہی ہیں، ہر محفل اور ہر چوپال میں انہی سوالات پر تبصرے ہو رہے ہیں، پورے شہر کی فضا میں ایک یہی موضوع گردش کر رہا ہے۔ غرض جہاں کہیں چار لوگ اکٹھے ہوتے ہیں ان کی گفتگو کی تان یہیں پر آ کر ٹوٹتی ہے۔

آیت ۲ ﴿عَنِ النَّبَاِ الۡعَظِیۡمِ ۲﴾ ”اُس بڑی خبر کے بارے میں۔“

یعنی قیامت کی خبر کے بارے میں۔ جیسے سورۃ المدثر میں فرمایا گیا ہے: ﴿اِنَّہَا لَاِحۡدَی الۡکُبَرِ ۳۵﴾ ”یقیناً یہ بہت بڑی باتوں میں سے ایک بات ہے۔“

آیت ۳ ﴿الَّذِیۡ ہُمۡ فِیۡہِ مُخۡتَلِفُوۡنَ ۳﴾ ”جس کے بارے میں یہ اختلافِ رائے میں مبتلا ہو گئے ہیں۔“

قیامت کے بارے میں تفصیلات سن کر ان میں سے کوئی کچھ کہتا ہے کوئی کچھ۔ کوئی کہتا ہے کہ مرنے کے بعد انسانوں کا دوبارہ زندہ ہونا بالکل بعید از قیاس ہے۔ کوئی کہتا ہے کہ ہمارے معبودوں کے ہوتے ہوئے ہم سے کوئی محاسبہ نہیں ہو سکتا۔ غرض جتنے منہ اتنی باتیں! ہر کوئی اپنی اپنی رائے دے رہا ہے۔

آیت ۴ ﴿کَلَّا سَیَعۡلَمُوۡنَ ۴﴾ ”نہیں! عنقریب یہ جان لیں گے۔“

عنقریب اصل حقیقت ان لوگوں پر منکشف ہو جائے گی۔ وقت آنے پر یہ لوگ اپنی آنکھوں سے سب کچھ دیکھ لیں گے۔ سورۂ قٓ میں اس کیفیت کا ذکر اس طرح ہوا ہے: ﴿لَقَدۡ کُنۡتَ فِیۡ غَفۡلَۃٍ مِّنۡ ہٰذَا فَکَشَفۡنَا عَنۡکَ غِطَآءَکَ فَبَصَرُکَ الۡیَوۡمَ حَدِیۡدٌ ۲۲﴾ ”(اللہ فرمائے گا: اے انسان!) تو اس دن سے غفلت میں رہا تھا! تو آج ہم نے تجھ سے تیرا پردہ ہٹا

دیا ہے‘ تو آج تمہاری نگاہ کتنی تیز ہو گئی ہے۔‘‘

آیت ۵ ﴿ثُمَّ كَلَّا سَيَعْلَمُوْنَ ۝۵﴾ ’’ہاں کوئی بات نہیں! عنقریب یہ جان لیں گے۔‘‘

عالمِ دنیا اور عالمِ برزخ کے درمیان صرف موت کا پردہ حائل ہے۔ جونہی کسی انسان کی آنکھ بند ہوتی ہے یہ پردہ اٹھ جاتا ہے۔ قبر عالمِ برزخ کی پہلی منزل ہے۔ اس منزل پر پہنچتے ہی ہر انسان اصل حقیقت کو جان جاتا ہے۔ چنانچہ وہ وقت دور نہیں جب ان میں سے ہر شخص پر اصل حقائق عیاں ہو جائیں گے۔

آیت ۶ ﴿اَلَمْ نَجْعَلِ الْاَرْضَ مِهٰدًا ۝۶﴾ ’’کیا ہم نے نہیں بنا دیا زمین کو بچھونا؟‘‘

آیت ۷ ﴿وَّالْجِبَالَ اَوْتَادًا ۝۷﴾ ’’اور پہاڑوں کو میخیں؟‘‘

زمین کا توازن برقرار رکھنے کے لیے پہاڑوں کو اس میں میخوں کی طرح گاڑ دیا۔

آیت ۸ ﴿وَّخَلَقْنٰكُمْ اَزْوَاجًا ۝۸﴾ ’’اور تمہیں ہم نے جوڑوں کی شکل میں پیدا کیا۔‘‘

آیت ۹ ﴿وَّجَعَلْنَا نَوْمَكُمْ سُبَاتًا ۝۹﴾ ’’اور تمہاری نیند کو بنا دیا ہم نے تھکان دور کرنے والی۔‘‘

آیت ۱۰ ﴿وَّجَعَلْنَا الَّيْلَ لِبَاسًا ۝۱۰﴾ ’’اور رات کو ہم نے بنا دیا ڈھانپ لینے والی۔‘‘

آیت ۱۱ ﴿وَّجَعَلْنَا النَّهَارَ مَعَاشًا ۝۱۱﴾ ’’اور دن کو ہم نے بنا دیا معاش (کی جِدّوجُہد) کے لیے۔‘‘

آیت ۱۲ ﴿وَّبَنَيْنَا فَوْقَكُمْ سَبْعًا شِدَادًا ۝۱۲﴾ ’’اور تمہارے اوپر بنا دیے ہم نے سات مضبوط آسمان۔‘‘

آیت ۱۳ ﴿وَّجَعَلْنَا سِرَاجًا وَّهَّاجًا ۝۱۳﴾ ’’اور ہم نے (سورج کو) بنا دیا ایک روشن چراغ۔‘‘

آیت ۱۴ ﴿وَّاَنْزَلْنَا مِنَ الْمُعْصِرٰتِ مَآءً ثَجَّاجًا ۝۱۴﴾ ’’اور ہم نے اتارو یا نچڑنے والی بدلیوں سے چھاجوں پانی۔‘‘

یعنی ہم پانی سے لبریز بادلوں سے موسلا دھار بارش برساتے ہیں۔

آیت ۱۵ ﴿لِّنُخْرِجَ بِهٖ حَبًّا وَّنَبَاتًا ۝۱۵﴾ ’’تاکہ اس کے ذریعے سے ہم نکالیں اناج اور دوسرے نباتات۔‘‘

آیت ۱۶ ﴿وَّجَنّٰتٍ اَلْفَافًا ۝۱۶﴾ ’’اور بڑے گھنے باغات بھی۔‘‘

آیت ۱۷ ﴿اِنَّ يَوْمَ الْفَصْلِ كَانَ مِيْقَاتًا ۝۱۷﴾ ’’یقیناً فیصلے کا دن ایک معیّن وقت ہے۔‘‘

یہ ہے وہ اصل بات جس کے لیے بطور تمہید گزشتہ آیات میں اللہ تعالیٰ کی رنگارنگ نعمتوں کا ذکر کیا گیا ہے۔ مطلب یہ کہ جب اللہ تعالیٰ نے بنی نوعِ انسان کے لیے اپنی نعمتوں کا اس قدر وسیع دستر خوان بچھایا ہے تو اس نے انسانوں پر لازماً کچھ ذِمّہ داریاں بھی ڈالی ہوں گی۔ جب خود انسانوں کے ہاں اصول ہے کہ ذِمّہ داریاں (responsibilities) اور مراعات (privileges) ایک ساتھ چلتی ہیں تو یہ بھلا کیسے ممکن ہے کہ اللہ تعالیٰ انسان پر اپنی عطاؤں کی بارش تو کرتا رہے اور اس پر ذِمّہ داری کوئی بھی نہ ڈالے۔ اس لیے تم لوگ یہ مت سمجھو کہ تم مَن مانی زندگی گزارتے رہو گے اور تم سے کوئی جوابدہی نہیں ہوگی۔ نہیں‘ تم سے ایک ایک ذِمّہ داری اور ایک ایک نعمت کا حساب ہوگا اور اس کے لیے ہم نے فیصلے کا ایک دن پہلے سے مقرر کر رکھا ہے۔

آیت ۱۸ ﴿يَّوْمَ يُنْفَخُ فِي الصُّوْرِ فَتَاْتُوْنَ اَفْوَاجًا ۝۱۸﴾ ’’جس دن پھونکا جائے گا صور میں تو تم سب چلے آؤ گے فوج در فوج۔‘‘

اس کیفیت کا نقشہ سورۃ المعارج میں اس طرح دکھایا گیا ہے: ﴿يَوْمَ يَخْرُجُوْنَ مِنَ الْاَجْدَاثِ سِرَاعًا كَاَنَّهُمْ اِلٰى نُصُبٍ يُّوْفِضُوْنَ ۝۴۳﴾ ’’جس دن وہ نکلیں گے اپنی قبروں سے دوڑتے ہوئے‘ جیسے کہ نشان زدہ اہداف کی طرف بھاگے جا رہے ہوں۔‘‘

آیت ۱۹ ﴿وَّفُتِحَتِ السَّمَآءُ فَكَانَتْ اَبْوَابًا ۝۱۹﴾ ’’اور آسمان کھول دیا جائے گا تو اس میں دروازے ہی دروازے بن جائیں گے۔‘‘

آیت ۲۰ ﴿وَّسُيِّرَتِ الْجِبَالُ فَكَانَتْ سَرَابًا ۝۲۰﴾ ’’اور پہاڑ چلا دیے جائیں گے تو وہ ہو جائیں گے چمکتی ہوئی ریت۔‘‘

آیت ۲۱ ﴿اِنَّ جَهَنَّمَ كَانَتْ مِرْصَادًا ۝۲۱﴾ ’’یقیناً جہنّم گھات میں ہے۔‘‘

جہنّم تو مجرم انسانوں کی صورت میں اپنے ایندھن کا انتظار کر رہی ہے۔

آیت ۲۲ ﴿لِّلطّٰغِيْنَ مَاٰبًا ۝۲۲﴾ ’’وہ ٹھکانہ ہے سرکش لوگوں کا۔‘‘

آیت ۲۳ ﴿لّٰبِثِيْنَ فِيْهَآ اَحْقَابًا ۝۲۳﴾ ’’وہ رہیں گے اس میں قرن ہا قرن۔‘‘

آیت ۲۴ ﴿لَا يَذُوْقُوْنَ فِيْهَا بَرْدًا وَّلَا شَرَابًا ۝۲۴﴾ ’’وہ نہیں چکھیں گے اس میں کوئی

ٹھنڈی شے اور نہ کوئی مشروب۔‘‘

آیت ۲۵ ﴿اِلَّا حَمِیۡمًا وَّ غَسَّاقًا ﴿۲۵﴾﴾ ’’سوائے کھولتے ہوئے پانی اور بہتی ہوئی پیپ کے۔‘‘

آیت ۲۶ ﴿جَزَآءً وِّفَاقًا ﴿۲۶﴾﴾ ’’بدلہ (ان کے اعمال کا) پورا پورا۔‘‘

ان لوگوں نے جیسے اعمال کیے ہوں گے‘ ویسا ہی ان لوگوں کے ساتھ وہاں سلوک کیا جائے گا۔

آیت ۲۷ ﴿اِنَّہُمۡ کَانُوۡا لَا یَرۡجُوۡنَ حِسَابًا ﴿۲۷﴾﴾ ’’یہ لوگ کسی حساب کتاب کی کوئی توقع نہیں رکھتے تھے۔‘‘

آیت ۲۸ ﴿وَّ کَذَّبُوۡا بِاٰیٰتِنَا کِذَّابًا ﴿۲۸﴾﴾ ’’اور انہوں نے جھٹلا دیا تھا ہماری آیات کو دھڑلے کے ساتھ۔‘‘

آیت ۲۹ ﴿وَ کُلَّ شَیۡءٍ اَحۡصَیۡنٰہُ کِتٰبًا ﴿۲۹﴾﴾ ’’اور ہم نے تو ہر چیز کو گِن گِن کر لکھ رکھا ہے۔‘‘

آیت ۳۰ ﴿فَذُوۡقُوۡا فَلَنۡ نَّزِیۡدَکُمۡ اِلَّا عَذَابًا ﴿۳۰﴾﴾ ’’تو اب چکھو! ہم ہرگز اضافہ نہیں کریں گے تمہارے لیے مگر عذاب ہی میں۔‘‘

تمہارے اس عذاب کی شدت ہر لحظہ بڑھتی چلی جائے گی ——— اب اگلی آیات میں اہلِ جنّت کا ذکر ہے:

آیات ۳۱ تا ۴۰

اِنَّ لِلۡمُتَّقِیۡنَ مَفَازًا ﴿۳۱﴾ حَدَآئِقَ وَ اَعۡنَابًا ﴿۳۲﴾ وَّ کَوَاعِبَ
اَتۡرَابًا ﴿۳۳﴾ وَّ کَاۡسًا دِہَاقًا ﴿۳۴﴾ لَا یَسۡمَعُوۡنَ فِیۡہَا لَغۡوًا وَّ لَا کِذّٰبًا ﴿۳۵﴾
جَزَآءً مِّنۡ رَّبِّکَ عَطَآءً حِسَابًا ﴿۳۶﴾ رَّبِّ السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضِ وَ
مَا بَیۡنَہُمَا الرَّحۡمٰنِ لَا یَمۡلِکُوۡنَ مِنۡہُ خِطَابًا ﴿۳۷﴾ یَوۡمَ یَقُوۡمُ الرُّوۡحُ
وَ الۡمَلٰٓئِکَۃُ صَفًّا ؕ لَّا یَتَکَلَّمُوۡنَ اِلَّا مَنۡ اَذِنَ لَہُ الرَّحۡمٰنُ وَ قَالَ
صَوَابًا ﴿۳۸﴾ ذٰلِکَ الۡیَوۡمُ الۡحَقُّ ۚ فَمَنۡ شَآءَ اتَّخَذَ اِلٰی رَبِّہٖ مَاٰبًا ﴿۳۹﴾

اِنَّاۤ اَنۡذَرۡنٰکُمۡ عَذَابًا قَرِیۡبًا ۚ یَّوۡمَ یَنۡظُرُ الۡمَرۡءُ مَا قَدَّمَتۡ یَدٰہُ وَ
یَقُوۡلُ الۡکٰفِرُ یٰلَیۡتَنِیۡ کُنۡتُ تُرٰبًا ﴿۴۰﴾

آیت ۳۱ ﴿اِنَّ لِلۡمُتَّقِیۡنَ مَفَازًا ﴿۳۱﴾﴾ ’’یقیناً اہل تقویٰ کے لیے کامیابی ہوگی۔‘‘

آیت ۳۲ ﴿حَدَآئِقَ وَ اَعۡنَابًا ﴿۳۲﴾﴾ ’’(اُن کے لیے) باغ اور انگور ہوں گے۔‘‘

آیت ۳۳ ﴿وَّ کَوَاعِبَ اَتۡرَابًا ﴿۳۳﴾﴾ ’’اور نوجوان ہم عمر بیویاں۔‘‘

آیت ۳۴ ﴿وَّ کَاۡسًا دِہَاقًا ﴿۳۴﴾﴾ ’’اور جام چھلکتے ہوئے۔‘‘

آیت ۳۵ ﴿لَا یَسۡمَعُوۡنَ فِیۡہَا لَغۡوًا وَّ لَا کِذّٰبًا ﴿۳۵﴾﴾ ’’وہ نہیں سنیں گے اس میں کوئی لغو بات اور نہ جھوٹ۔‘‘

آیت ۳۶ ﴿جَزَآءً مِّنۡ رَّبِّکَ عَطَآءً حِسَابًا ﴿۳۶﴾﴾ ’’یہ بدلہ ہوگا آپ کے رب کی طرف سے‘ دیا ہوا حساب سے۔‘‘

یہ سب کچھ ان لوگوں کی محنت اور قربانیوں کے بدلے کے طور پر انہیں عطا کیا جائے گا۔

آیت ۳۷ ﴿رَّبِّ السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضِ وَ مَا بَیۡنَہُمَا الرَّحۡمٰنِ﴾ ’’جو رب ہے آسمانوں کا اور زمین کا اور جو کچھ ان کے مابین ہے‘ جو الرحمٰن ہے۔‘‘

﴿لَا یَمۡلِکُوۡنَ مِنۡہُ خِطَابًا ﴿۳۷﴾﴾ ’’ان (میں سے کسی) کو ہمت نہیں ہوگی اس سے بات کرنے کی۔‘‘

آیت ۳۸ ﴿یَوۡمَ یَقُوۡمُ الرُّوۡحُ وَ الۡمَلٰٓئِکَۃُ صَفًّا ؕ﴾ ’’جس دن کھڑے ہوں گے جبرائیل اور تمام فرشتے صفیں باندھے۔‘‘

﴿لَّا یَتَکَلَّمُوۡنَ اِلَّا مَنۡ اَذِنَ لَہُ الرَّحۡمٰنُ﴾ ’’وہ کوئی بات نہ کر سکیں گے سوائے اُس کے جسے رحمٰن کی طرف سے اجازت مل جائے‘‘

﴿وَ قَالَ صَوَابًا ﴿۳۸﴾﴾ ’’اور وہ بات بھی درست کرے۔‘‘

آیت ۳۹ ﴿ذٰلِکَ الۡیَوۡمُ الۡحَقُّ ۚ﴾ ’’یہ دن حق ہے!‘‘

یعنی قیامت کا دن ایک اٹل حقیقت ہے‘ جیسا کہ سورۃ الواقعہ میں فرمایا گیا: ﴿اِذَا وَقَعَتِ الۡوَاقِعَۃُ ﴿۱﴾ لَیۡسَ لِوَقۡعَتِہَا کَاذِبَۃٌ ﴿۲﴾﴾ ’’جب وہ ہونے والا واقعہ رونما ہو جائے گا۔ (اور

جان لو) اس کے واقع ہونے میں کوئی جھوٹ نہیں ہے‘‘۔ سورۃ الحاقہ میں قیامت کے اٹل ہونے کا ذکر اس طرح آیا ہے: ﴿اَلۡحَآقَّۃُ ﴿۱﴾ مَا الۡحَآقَّۃُ ﴿۲﴾ وَ مَاۤ اَدۡرٰىکَ مَا الۡحَآقَّۃُ ﴿۳﴾﴾ ’’وہ حق ہوجانے والی۔ کیا ہے وہ حق ہوجانے والی؟ اور تم نے کیا سمجھا کہ وہ حق ہونے والی کیا ہے؟‘‘

﴿فَمَنۡ شَآءَ اتَّخَذَ اِلٰی رَبِّہٖ مَاٰبًا ﴿۳۹﴾﴾ ’’تو جو چاہے اپنے رب کی طرف اپنا ٹھکانہ بنالے۔‘‘

آیت ۴۰ ﴿اِنَّاۤ اَنۡذَرۡنٰکُمۡ عَذَابًا قَرِیۡبًا﴾ ’’دیکھو! ہم نے تو تمہیں خبردار کردیا ہے اس عذاب سے جو بالکل قریب ہے۔‘‘

تصور کیجیے‘ یہ عذاب انسان کے کتنا قریب ہے! ادھر انسان کی آنکھ بند ہوتی ہے‘ ادھر اسے قبر میں اتارنے کا بندوبست کردیا جاتا ہے۔ اور قبر کیا ہے؟ حضور ﷺ کا فرمان ہے کہ ((اِنَّمَا الْقَبْرُ رَوْضَۃٌ مِنْ رِیَاضِ الْجَنَّۃِ اَوْ حُفْرَۃٌ مِنْ حُفَرِ النَّارِ))[۱] ’’قبر یا تو جنت کے باغیچوں میں سے ایک باغیچہ ہے یا جہنم کے گڑھوں میں سے ایک گڑھا‘‘۔ گویا ہر زندہ انسان اس باغیچے یا گڑھے سے صرف چند گھنٹوں کے فاصلے پر بیٹھا ہے۔

﴿یَّوۡمَ یَنۡظُرُ الۡمَرۡءُ مَا قَدَّمَتۡ یَدٰہُ﴾ ’’جس دن انسان دیکھ لے گا جو اُس کے دونوں ہاتھوں نے آگے بھیجا تھا‘‘

﴿وَ یَقُوۡلُ الۡکٰفِرُ یٰلَیۡتَنِیۡ کُنۡتُ تُرٰبًا ﴿۴۰﴾﴾ ’’اور کافر کہے گا: کاش کہ میں مٹی ہوتا!‘‘

کاش مجھے شرفِ انسانیت ملا ہی نہ ہوتا! ’’مرا اے کاش کہ مادر نہ زادے!‘‘ کاش میری ماں نے مجھے جنا ہی نہ ہوتا![۲]

❀❀❀

۱۔ سنن الترمذی‘ کتاب صفۃ القیامۃ والرقائق والورع‘ راوی: ابوسعید الخدری ؓ۔

۲۔ بعض روایات کے مطابق اللہ تعالیٰ حیوانات کے درمیان بھی عدل و انصاف کے مطابق فیصلہ فرمائے گا‘ حتیٰ کہ ایک سینگ والی بکری نے بے سینگ والی پر کوئی زیادتی کی ہوگی تو اس کا بھی بدلہ دلائے گا۔ اس سے فراغت کے بعد اللہ تعالیٰ جانوروں کو حکم دے گا کہ مٹی ہوجاؤ۔ چنانچہ وہ مٹی ہوجائیں گے۔ اس وقت کافر بھی آرزو کریں گے کہ کاش وہ بھی حیوان ہوتے اور آج مٹی بن جاتے۔ (تفسیر ابن کثیر)

سُوۡرَۃُ النّٰزِعٰتِ

سورۃ الصافات‘ سورۃ الذاریات اور سورۃ المرسلات کے بعد سورۃ النازعات پے در پے قسموں سے شروع ہونے والی قرآن مجید کی چوتھی سورت ہے۔ اس سورت کے آغاز میں مذکور قسموں کے بارے میں اکثر مفسرین کی رائے ہے کہ ان میں فرشتوں کا ذکر ہے۔

آیات ۱ تا ۲۶

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ○

وَ النّٰزِعٰتِ غَرۡقًا ﴿۱﴾ وَّ النّٰشِطٰتِ نَشۡطًا ﴿۲﴾ وَّ السّٰبِحٰتِ سَبۡحًا ﴿۳﴾
فَالسّٰبِقٰتِ سَبۡقًا ﴿۴﴾ فَالۡمُدَبِّرٰتِ اَمۡرًا ﴿۵﴾ یَوۡمَ تَرۡجُفُ الرَّاجِفَۃُ ﴿۶﴾
تَتۡبَعُہَا الرَّادِفَۃُ ﴿۷﴾ قُلُوۡبٌ یَّوۡمَئِذٍ وَّاجِفَۃٌ ﴿۸﴾ اَبۡصَارُہَا خَاشِعَۃٌ ﴿۹﴾
یَقُوۡلُوۡنَ ءَاِنَّا لَمَرۡدُوۡدُوۡنَ فِی الۡحَافِرَۃِ ﴿۱۰﴾ ءَاِذَا کُنَّا عِظَامًا
نَّخِرَۃً ﴿۱۱﴾ قَالُوۡا تِلۡکَ اِذًا کَرَّۃٌ خَاسِرَۃٌ ﴿۱۲﴾ فَاِنَّمَا ہِیَ زَجۡرَۃٌ
وَّاحِدَۃٌ ﴿۱۳﴾ فَاِذَا ہُمۡ بِالسَّاہِرَۃِ ﴿۱۴﴾ ہَلۡ اَتٰىکَ حَدِیۡثُ مُوۡسٰی ﴿۱۵﴾
اِذۡ نَادٰىہُ رَبُّہٗ بِالۡوَادِ الۡمُقَدَّسِ طُوًی ﴿۱۶﴾ اِذۡہَبۡ اِلٰی فِرۡعَوۡنَ اِنَّہٗ
طَغٰی ﴿۱۷﴾ فَقُلۡ ہَلۡ لَّکَ اِلٰۤی اَنۡ تَزَکّٰی ﴿۱۸﴾ وَ اَہۡدِیَکَ اِلٰی رَبِّکَ
فَتَخۡشٰی ﴿۱۹﴾ فَاَرٰىہُ الۡاٰیَۃَ الۡکُبۡرٰی ﴿۲۰﴾ فَکَذَّبَ وَ عَصٰی ﴿۲۱﴾ ثُمَّ اَدۡبَرَ
یَسۡعٰی ﴿۲۲﴾ فَحَشَرَ فَنَادٰی ﴿۲۳﴾ فَقَالَ اَنَا رَبُّکُمُ الۡاَعۡلٰی ﴿۲۴﴾ فَاَخَذَہُ اللّٰہُ
نَکَالَ الۡاٰخِرَۃِ وَ الۡاُوۡلٰی ﴿۲۵﴾ اِنَّ فِیۡ ذٰلِکَ لَعِبۡرَۃً لِّمَنۡ یَّخۡشٰی ﴿۲۶﴾

آیت ۱ ﴿وَ النّٰزِعٰتِ غَرۡقًا ﴿۱﴾﴾ ’’قسم ہے اُن (فرشتوں) کی جو غوطہ لگا کر کھینچتے ہیں۔‘‘

نزع کے معنی سختی سے کھینچنے کے ہیں۔ یعنی ان فرشتوں کی قسم جو انسان کے وجود کی گہرائی میں اُتر کر بڑی سختی اور شدت سے اس کی جان کو کھینچ نکالتے ہیں۔

آیت ۲ ﴿وَّالنّٰشِطٰتِ نَشْطًا ۝۲﴾ ''اور اُن (فرشتوں) کی قسم جو گرہیں کھولتے ہیں آسانی سے۔''

یہ بھی انسان کی جان قبض ہونے کی ہی ایک کیفیت کا ذکر ہے۔ حضور ﷺ کے ایک فرمان کا مفہوم ہے کہ جب فرشتہ بندۂ مؤمن کی جان قبض کرتا ہے تو اسے ایسے محسوس ہوتا ہے جیسے مشکیزے کے بند منہ سے پانی کا ایک قطرہ ٹپک گیا ہے اور جب وہ کسی کافر کی جان قبض کرتا ہے تو اُسے ایسی سختی کا سامنا کرنا پڑتا ہے جیسے سیخ پر سے کباب کھینچا جا رہا ہے (اَعَاذَنَا اللّٰہُ مِنْ ذٰلِکَ)۔ بہرحال یہاں یہ نکتہ سمجھنا ضروری ہے کہ ان دونوں کیفیات کا تعلق انسان کی روح سے ہے' اس کے ظاہری جسم سے نہیں۔ جسمانی طور پر تو اللہ تعالیٰ کے بہت سے نیک بندوں پر بھی نزع کا وقت سخت انداز میں وارد ہوتا ہے۔ اس معاملے میں ظاہری تکلیف تو خود حضور ﷺ پر بھی طاری ہوئی تھی۔ روایات میں آتا ہے کہ حضرت فاطمہ ؓ حضور ﷺ کی تکلیف کو دیکھ کر بار بار روتی تھیں اور اُنؓ کے منہ سے بے اختیار یا ابتاہ! یا ابتاہ! (ہائے میرے ابا جانؐ کی یہ تکلیف!) کے الفاظ نکلتے تھے۔ حضور ﷺ یہ سن کر فرماتے کہ بیٹی! آج کے بعد تیرے باپ کے لیے کوئی سختی نہیں ہے۔ فِداہ آبائنا واُمھاتنا!

آیت ۳ ﴿وَّالسّٰبِحٰتِ سَبْحًا ۝۳﴾ ''اور اُن (فرشتوں) کی قسم جو تیزی سے تیرتے ہوئے جاتے ہیں۔''

فرشتے تیرتے ہوئے ان ارواح کو لے کر کہاں جاتے ہیں اور انہیں کہاں رکھا جاتا ہے؟ اس بارے میں وضاحت آگے سورۃ المُطَفِّفِین میں آئے گی۔

آیت ۴ ﴿فَالسّٰبِقٰتِ سَبْقًا ۝۴﴾ ''پھر وہ (تعمیلِ ارشاد میں) ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کی کوشش کرتے ہیں۔''

آیت ۵ ﴿فَالْمُدَبِّرٰتِ اَمْرًا ۝۵﴾ ''پھر (حسبِ حکم) معاملات کی تدبیر کرتے ہیں۔''

یعنی ہر مرنے والے کی روح کو فرشتے اللہ تعالیٰ کے حکم کے مطابق سِجّین یا عِلّیّین میں لے جاتے ہیں۔ یہاں پر ان قسموں کا جواب یا مقسم علیہ چونکہ محذوف ہے' اس لیے ان قسموں کا

مقسم علیہ بھی وہی تصور ہوگا جو سورۃ الذاریات اور سورۃ المرسلات میں مذکور ہے۔ یعنی: ﴿اِنَّمَا تُوْعَدُوْنَ لَصَادِقٌ ۝۵ وَّاِنَّ الدِّیْنَ لَوَاقِعٌ ۝۶﴾ (الذّٰرِیٰت) ''جو وعدہ تمہیں دیا جا رہا ہے وہ یقیناً سچ ہے۔ اور جزا و سزا ضرور واقع ہو کر رہے گی''۔ اور: ﴿اِنَّمَا تُوْعَدُوْنَ لَوَاقِعٌ ۝۷﴾ (المرسلٰت) ''جس چیز کا تم سے وعدہ کیا جا رہا ہے وہ یقیناً واقع ہو کر رہے گی۔''

آیت ۶ ﴿یَوْمَ تَرْجُفُ الرَّاجِفَۃُ ۝۶﴾ ''جس دن کانپے گی کانپنے والی۔''

یعنی قیامت کے دن شدید زلزلے کی وجہ سے پوری زمین لرز اٹھے گی۔ قیامت کے زلزلے اور اس دن کی ہولناک کیفیات کا ذکر قرآن مجید میں بہت تکرار کے ساتھ آیا ہے۔ سورۃ الحج کی ابتدائی آیات کا یہ انداز بہت عبرت آموز ہے:

﴿یٰٓاَیُّھَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّکُمْ ۚ اِنَّ زَلْزَلَۃَ السَّاعَۃِ شَیْءٌ عَظِیْمٌ ۝۱ یَوْمَ تَرَوْنَھَا تَذْھَلُ کُلُّ مُرْضِعَۃٍ عَمَّآ اَرْضَعَتْ وَتَضَعُ کُلُّ ذَاتِ حَمْلٍ حَمْلَھَا وَتَرَی النَّاسَ سُکٰرٰی وَمَا ھُمْ بِسُکٰرٰی وَلٰکِنَّ عَذَابَ اللّٰہِ شَدِیْدٌ ۝۲﴾

''اے لوگو! تقویٰ اختیار کرو اپنے رب کا' یقیناً قیامت کا زلزلہ بہت بڑی چیز ہوگا۔ جس دن تم اُس کو دیکھو گے' اُس دن (حال یہ ہوگا کہ) بھول جائے گی ہر دودھ پلانے والی جسے وہ دودھ پلاتی تھی اور (دہشت کا عالم یہ ہوگا کہ) ہر حاملہ کا حمل گر جائے گا اور تم دیکھو گے لوگوں کو جیسے وہ نشے میں ہوں' حالانکہ وہ نشے میں نہیں ہوں گے' بلکہ اللہ کا عذاب ہی بہت سخت ہے۔''

آیت ۷ ﴿تَتْبَعُھَا الرَّادِفَۃُ ۝۷﴾ ''اُس کے پیچھے ایک اور جھٹکا آئے گا۔''

اس سے نفخہ ثانیہ مراد ہے' جس کے بعد سب مُردے دوبارہ زندہ ہو جائیں گے۔

آیت ۸ ﴿قُلُوْبٌ یَّوْمَئِذٍ وَّاجِفَۃٌ ۝۸﴾ ''کتنے ہی دل اُس دن (خوف کے مارے) دھڑک رہے ہوں گے۔''

آیت ۹ ﴿اَبْصَارُھَا خَاشِعَۃٌ ۝۹﴾ ''اُن کی نگاہیں جھکی ہوئی ہوں گی۔''

فرطِ خوف سے آنکھیں زمین میں گڑی ہوئی ہوں گی' اوپر آنکھ اٹھا کر دیکھنے کی ہمت نہ ہوگی۔

آیت ۱۰ ﴿یَقُوْلُوْنَ ءَاِنَّا لَمَرْدُوْدُوْنَ فِی الْحَافِرَۃِ ۝۱۰﴾ ''یہ لوگ کہتے ہیں: کیا ہمیں لوٹا دیا جائے گا اُلٹے پاؤں؟''

کہ کیا مرنے کے بعد ہمیں پھر سے زندہ کر دیا جائے گا؟

آیت ۱۱ ﴿ءَاِذَا كُنَّا عِظَامًا نَّخِرَةً ⑪﴾ ''کیا جب ہم کھوکھلی ہڈیاں ہو چکے ہوں گے؟''

آیت ۱۲ ﴿قَالُوْا تِلْكَ اِذًا كَرَّةٌ خَاسِرَةٌ ⑫﴾ ''کہتے ہیں: تب تو یہ لوٹنا بہت گھاٹے کا سودا ہوگا۔''

قیامت سے متعلق خبروں پر وہ لوگ طنزیہ انداز میں ایسے تبصرے کرتے تھے۔

آیت ۱۳ ﴿فَاِنَّمَا هِيَ زَجْرَةٌ وَّاحِدَةٌ ⑬﴾ ''حالانکہ یہ تو بس ایک ہی ڈانٹ ہوگی۔''

آیت ۱۴ ﴿فَاِذَا هُمْ بِالسَّاهِرَةِ ⑭﴾ ''تو وہ سب کے سب ایک چٹیل میدان میں ہوں گے۔''

نفخہ ثانیہ کے بعد سب کے سب انسان زندہ ہو کر میدانِ حشر میں جمع ہو جائیں گے۔

آیت ۱۵ ﴿هَلْ اَتٰىكَ حَدِيْثُ مُوْسٰى ⑮﴾ ''کیا آپ تک موسیٰؑ کی خبر پہنچی ہے؟''

آیت ۱۶ ﴿اِذْ نَادٰىهُ رَبُّهٗ بِالْوَادِ الْمُقَدَّسِ طُوًى ⑯﴾ ''جب اُس کو پکارا تھا اُس کے پروردگار نے طویٰ کی مقدس وادی میں۔''

یہ واقعہ سورۃ الاعراف‘ سورۂ طٰہٰ اور سورۃ القصص میں بہت تفصیل سے بیان ہوا ہے۔ یہاں اس چھوٹی سورت میں اس کا ذکر نہایت اختصار کے ساتھ آیا ہے۔

آیت ۱۷ ﴿اِذْهَبْ اِلٰى فِرْعَوْنَ اِنَّهٗ طَغٰى ⑰﴾ ''کہ جاؤ فرعون کے پاس‘ وہ بہت سرکش ہو گیا ہے۔''

حضرت موسیٰ علیہ السلام اس حکم کے تحت اللہ تعالیٰ کے رسول کی حیثیت سے فرعون کے پاس گئے تھے۔

آیت ۱۸ ﴿فَقُلْ هَلْ لَّكَ اِلٰٓى اَنْ تَزَكّٰى ⑱﴾ ''اور اسے کہو کہ کیا تو چاہتا ہے کہ پاک ہو جائے؟''

آپؑ اس کے پاس جا کر اسے باقاعدہ دعوت دیں‘ تاکہ اگر وہ راہِ راست پر آنا چاہے تو آ جائے اور اپنے عقائد و اعمال کو درست کر لے۔

آیت ۱۹ ﴿وَاَهْدِيَكَ اِلٰى رَبِّكَ فَتَخْشٰى ⑲﴾ ''اور میں تمہاری راہنمائی کروں تمہارے رب کی طرف تاکہ تمہارے اندر خشیت پیدا ہو؟''

آیت ۲۰ ﴿فَاَرٰىهُ الْاٰيَةَ الْكُبْرٰى ⑳﴾ ''تو موسیٰؑ نے اُس کو دکھائی بہت بڑی نشانی۔''

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرعون کو اپنی رسالت کے بارے میں بھی بتایا‘ اللہ تعالیٰ کا پیغام بھی اُس تک پہنچایا اور عصا کے اژدھا بن جانے والا معجزہ بھی اُسے دکھا دیا۔

آیت ۲۱ ﴿فَكَذَّبَ وَعَصٰى ㉑﴾ ''لیکن اُس نے جھٹلا دیا اور نافرمانی کی۔''

آیت ۲۲ ﴿ثُمَّ اَدْبَرَ يَسْعٰى ㉒﴾ ''پھر وہ پلٹا بھاگ دوڑ کرنے کے لیے۔''

حضرت موسیٰ علیہ السلام کا مقابلہ کرنے کے لیے اس نے ملک بھر سے ماہر جادوگروں کو اکٹھا کرنے کی کوششیں شروع کر دیں۔

آیت ۲۳ ﴿فَحَشَرَ فَنَادٰى ㉓﴾ ''پھر اس نے (اپنی رعیت کو) جمع کیا اور اعلان کیا۔''

آیت ۲۴ ﴿فَقَالَ اَنَا رَبُّكُمُ الْاَعْلٰى ㉔﴾ ''پس کہا کہ مَیں ہوں تمہارا سب سے بڑا ربّ!''

ظاہر ہے فرعون نے خود کو ''ربّ'' اس معنی میں نہیں کہا تھا کہ وہ اس کائنات کا یا اپنے ملک کے لوگوں کا خالق ہے‘ بلکہ وہ تو خود باطل معبودوں کو پوجتا تھا (سورۃ الاعراف کی آیت ۱۲۷ سے ثابت ہوتا ہے کہ فرعون اور اُس کی قوم کے لوگوں نے پوجا پاٹ کے لیے اپنے کچھ معبود بھی بنا رکھے تھے)۔ پھر اس کی رعیت میں بہت سے بڑے بوڑھے لوگ ایسے بھی ہوں گے جن کے سامنے وہ پیدا ہوا ہوگا اور جنہوں نے اس کا بچپن بھی دیکھا ہوگا۔ گویا اُسے خود بھی معلوم تھا اور اُس کی رعیت کے تمام لوگ بھی جانتے تھے کہ وہ عام انسانوں کی طرح پیدا ہوا ہے اور بحیثیت انسان وہ دوسرے عام انسانوں جیسا ہی ہے۔ چنانچہ اس کا مذکورہ دعویٰ دراصل حکومت اور اقتدارِ اعلیٰ کے مالک ہونے کا دعویٰ تھا۔ اپنے اس دعوے کی مزید وضاحت اُس نے ان الفاظ میں کی تھی: ﴿يٰقَوْمِ اَلَيْسَ لِيْ مُلْكُ مِصْرَ وَهٰذِهِ الْاَنْهٰرُ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِيْ ۚ﴾ (الزخرف: ۵۱) ''اے میری قوم کے لوگو! کیا مصر کی حکومت میری نہیں ہے؟ اور کیا یہ نہریں میرے نیچے نہیں بہہ رہی ہیں؟'' کہ دیکھو اس پورے ملک پر میرا حکم چلتا ہے‘ پورے ملک کا نہری نظام بھی میرے تابع ہے‘ مَیں جسے جو چاہوں عطا کروں اور جسے چاہوں محروم رکھوں‘ مَیں مطلق اختیار اور اقتدار کا مالک ہوں۔ یہ تھا اُس کا اصل دعویٰ اور یہی دعویٰ اپنے زمانے میں نمرود کا بھی تھا۔

یہ دعویٰ دراصل اللہ تعالیٰ کے اقتدار و اختیار کو چیلنج کرنے کے مترادف ہے اور اس لحاظ سے

بہت بڑا شرک ہے۔ آج بدقسمتی سے یہ سیاسی شرک ’’عوام کی حکومت‘‘ کے لیبل کے ساتھ پوری دنیا میں پھیل چکا ہے۔ نمرودی اور فرعونی دور میں تو شرک کی گندگی کا یہ ٹوکرا کوئی ایک شخص اٹھائے پھرتا تھا‘ یعنی ’’حاکمیت‘‘ کا دعوے دار کوئی ایک شخص ہوا کرتا تھا‘ جبکہ آج اس گندگی کو تولوں اور ماشوں میں بانٹ کر ملک کے ہر شہری کو اس میں حصہ دار بنا دیا گیا ہے۔ ’’جدید دور‘‘ میں اس سیاسی شرک کو نئے بھیس میں متعارف کرانے کی ضرورت کیوں پیش آئی؟ اس کی تعبیر علامہ اقبال نے اپنی نظم ’’ابلیس کی مجلسِ شوریٰ‘‘ میں ابلیس کی زبان سے اس طرح کی ہے:۔

ہم نے خود شاہی کو پہنایا ہے جمہوری لباس
جب ذرا آدم ہوا ہے خود شناس و خود نگر

آیت ۲۵ ﴿فَاَخَذَهُ اللّٰهُ نَكَالَ الْاٰخِرَةِ وَالْاُوْلٰى ﴿٢٥﴾﴾ ’’تو پکڑ لیا اُس کو اللہ نے آخرت اور دنیا کی سزا میں۔‘‘

دنیا کی سزا کے طور پر تو اسے اپنے لاؤ لشکر سمیت غرق کر دیا گیا۔ جہاں تک اُس کی آخرت کی سزا کا تعلق ہے اس کا ذکر قرآن میں جا بجا ہوا ہے کہ وہ بہت بھیانک ہوگی۔

آیت ۲۶ ﴿اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَعِبْرَةً لِّمَنْ يَّخْشٰى ﴿٢٦﴾﴾ ’’یقیناً اس میں عبرت ہے اُس کے لیے جو ڈرتا ہے۔‘‘

اشتقاقی اعتبار سے لفظ ’’عبرت‘‘ کا تعلق ’’عبور‘‘ سے ہے‘ اور عبور کے معنی ہیں: دریا وغیرہ کے ایک کنارے سے دوسرے کنارے تک جانا۔ اس حوالے سے لفظ عبرت کے معنی ایک چیز کو دیکھ کر اس سے ملتی جلتی کسی دوسری چیز کی حقیقت کو سمجھنے اور اس خاص معاملے میں سبق حاصل کرنے کے ہیں۔

آیات ۲۷ تا ۴۶

ءَاَنْتُمْ اَشَدُّ خَلْقًا اَمِ السَّمَآءُ ؕ بَنٰهَا ﴿٢٧﴾ رَفَعَ سَمْكَهَا فَسَوّٰىهَا ﴿٢٨﴾ وَ
اَغْطَشَ لَيْلَهَا وَاَخْرَجَ ضُحٰىهَا ﴿٢٩﴾ وَ الْاَرْضَ بَعْدَ ذٰلِكَ دَحٰىهَا ﴿٣٠﴾
اَخْرَجَ مِنْهَا مَآءَهَا وَ مَرْعٰىهَا ﴿٣١﴾ وَالْجِبَالَ اَرْسٰىهَا ﴿٣٢﴾ مَتَاعًا
لَّكُمْ وَ لِاَنْعَامِكُمْ ﴿٣٣﴾ فَاِذَا جَآءَتِ الطَّآمَّةُ الْكُبْرٰى ﴿٣٤﴾ يَوْمَ

يَتَذَكَّرُ الْاِنْسَانُ مَا سَعٰى ﴿٣٥﴾ وَ بُرِّزَتِ الْجَحِيْمُ لِمَنْ يَّرٰى ﴿٣٦﴾
فَاَمَّا مَنْ طَغٰى ﴿٣٧﴾ وَاٰثَرَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا ﴿٣٨﴾ فَاِنَّ الْجَحِيْمَ هِيَ
الْمَاْوٰى ﴿٣٩﴾ وَاَمَّا مَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ وَ نَهَى النَّفْسَ عَنِ
الْهَوٰى ﴿٤٠﴾ فَاِنَّ الْجَنَّةَ هِيَ الْمَاْوٰى ﴿٤١﴾ يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ السَّاعَةِ
اَيَّانَ مُرْسٰىهَا ﴿٤٢﴾ فِيْمَ اَنْتَ مِنْ ذِكْرٰىهَا ﴿٤٣﴾ اِلٰى رَبِّكَ
مُنْتَهٰىهَا ﴿٤٤﴾ اِنَّمَآ اَنْتَ مُنْذِرُ مَنْ يَّخْشٰىهَا ﴿٤٥﴾ كَاَنَّهُمْ يَوْمَ يَرَوْنَهَا
لَمْ يَلْبَثُوْٓا اِلَّا عَشِيَّةً اَوْ ضُحٰىهَا ﴿٤٦﴾

اب اگلی آیات میں بعث بعد الموت کے حوالے سے مشرکین کے طنزیہ تبصروں کا تفصیلی جواب دیا جا رہا ہے:

آیت ۲۷ ﴿ءَاَنْتُمْ اَشَدُّ خَلْقًا اَمِ السَّمَآءُ ؕ بَنٰهَا ﴿٢٧﴾﴾ ’’(اے لوگو! ذرا سوچو!) کیا تمہاری تخلیق زیادہ مشکل ہے یا آسمان کی؟ اس نے اسے تخلیق کیا۔‘‘

آیت ۲۸ ﴿رَفَعَ سَمْكَهَا فَسَوّٰىهَا ﴿٢٨﴾﴾ ’’اس کے گنبد کو بلند کیا‘ پھر اسے ہر طرح سے درست کیا۔‘‘

آیت ۲۹ ﴿وَاَغْطَشَ لَيْلَهَا وَاَخْرَجَ ضُحٰىهَا ﴿٢٩﴾﴾ ’’اور اس کی رات کو اندھیرا کر دیا اور اس کے دن کو ظاہر کر دیا۔‘‘

آیت ۳۰ ﴿وَالْاَرْضَ بَعْدَ ذٰلِكَ دَحٰىهَا ﴿٣٠﴾﴾ ’’اور زمین کو اس کے بعد بچھا دیا۔‘‘

آیت ۳۱ ﴿اَخْرَجَ مِنْهَا مَآءَهَا وَمَرْعٰىهَا ﴿٣١﴾﴾ ’’اس میں سے نکالا اس کا پانی اور اس کا چارہ۔‘‘

یہاں یہ نکتہ خصوصی طور پر لائقِ توجہ ہے کہ اس وقت دنیا میں جتنا پانی موجود ہے اس کا منبع خود زمین ہے۔ آج سائنسی معلومات کی روشنی میں ہم اس کی وضاحت یوں کر سکتے ہیں کہ ابتدا میں زمین آگ کا ایک گولا تھی۔ جوں جوں یہ ٹھنڈی ہوتی گئی اس کے بخارات نکل کر فضا میں جمع ہوتے رہے۔ اس طرح زمین کے اردگرد مختلف گیسوں پر مشتمل ایک غلاف سا بن گیا‘ جسے آج ہم فضا (atmosphere) کہتے ہیں۔ پھر کسی مرحلے پر فضا میں ہائیڈروجن اور آکسیجن کے ملاپ سے پانی بنا۔ یہ پانی فضا سے بارش کی شکل میں سالہا سال تک زمین پر برستا رہا۔ اس کے بعد سورج کی

تپش سے بخارات اٹھنے، بادل بننے اور بارش برسنے کے معمول پر مشتمل پانی کا وہ مربوط نظام بنا جسے آج کی سائنس نے واٹر سائیکل (water cycle) کا نام دیا ہے۔

گویا اللہ تعالیٰ نے ایک خاص مقدار کے مطابق دنیا میں پانی پیدا فرما کر زمین پر موجود ''زندگی'' کی ضروریات پوری کرنے کے لیے اس کی رسد اور ترسیل کا ایک خوبصورت نظام (cycle) تشکیل دے دیا ہے۔ اس نظام کے تحت سمندروں کے بخارات سے بادل بنتے ہیں۔ ان بادلوں سے اللہ تعالیٰ کی مشیت اور حکمت کے تحت مختلف علاقوں میں بارش برستی ہے اور برفباری ہوتی ہے۔ پھر پہاڑوں پر برف کے وسیع ذخائر سے نالوں اور دریاؤں کے ذریعے نشیبی علاقوں کو سارا سال پانی کی سپلائی جاری رہتی ہے۔ گویا بارشوں اور پہاڑی گلیشیرز کے overhead tanks سے حاصل ہونے والے پانی سے پوری دنیا میں زیرزمین پانی کے ذخیرے کو رسد بھی مہیا ہوتی رہتی ہے اور ہر طرح کی ''زندگی'' کی تمام ضروریات بھی پوری ہوتی ہیں۔ اس کے بعد جو پانی بچ رہتا ہے وہ واپس سمندر میں چلا جاتا ہے۔

آیت ۳۲ ﴿وَالۡجِبَالَ اَرۡسٰهَا ﴿۳۲﴾﴾ ''اور پہاڑوں کو اس میں گاڑ دیا۔''

آیت ۳۳ ﴿مَتَاعًا لَّكُمۡ وَلِاَنۡعَامِكُمۡ ﴿۳۳﴾﴾ ''سامانِ زیست کے طور پر تمہارے لیے اور تمہارے چوپایوں کے لیے۔''

آیت ۳۴ ﴿فَاِذَا جَآءَتِ الطَّآمَّةُ الۡكُبۡرٰى ﴿۳۴﴾﴾ ''پھر جب برپا ہو گا وہ بڑا ہنگامہ۔''

آیت ۳۵ ﴿يَوۡمَ يَتَذَكَّرُ الۡاِنۡسَانُ مَا سَعٰى ﴿۳۵﴾﴾ ''اُس دن انسان یاد کرے گا جو کچھ اُس نے بھاگ دوڑ کی تھی۔''

اُس دن انسان کی آنکھیں کھلیں گی اور جس شخص نے اپنی ساری زندگی دنیا کے مال و متاع کے پیچھے بھاگتے بھاگتے برباد کر دی تھی اُسے معلوم ہو جائے گا کہ اب آخرت کے لیے اس کے پاس کچھ بھی نہیں ہے۔ سورۃ الکہف کی اس آیت میں ایسے ہی لوگوں کا ذکر ہے: ﴿قُلۡ هَلۡ نُنَبِّئُكُمۡ بِالۡاَخۡسَرِيۡنَ اَعۡمَالًا ﴿۱۰۳﴾ اَلَّذِيۡنَ ضَلَّ سَعۡيُهُمۡ فِى الۡحَيٰوةِ الدُّنۡيَا وَهُمۡ يَحۡسَبُوۡنَ اَنَّهُمۡ يُحۡسِنُوۡنَ صُنۡعًا ﴿۱۰۴﴾﴾ ''آپ کہیے: کیا ہم تمہیں بتائیں کہ اپنے اعمال کے اعتبار سے سب سے زیادہ خسارے میں کون ہیں؟ وہ لوگ جن کی سعی و جہد دُنیا ہی کی زندگی میں گم ہو کر رہ گئی اور وہ سمجھتے ہیں کہ وہ بہت اچھا کام کر رہے ہیں۔''

آیت ۳۶ ﴿وَبُرِّزَتِ الۡجَحِيۡمُ لِمَنۡ يَّرٰى ﴿۳۶﴾﴾ ''اور کھول کر رکھ دی جائے گی جہنم ہر دیکھنے والے کے لیے۔''

آیت ۳۷ ﴿فَاَمَّا مَنۡ طَغٰى ﴿۳۷﴾﴾ ''پس جس نے سرکشی کی تھی۔''

آیت ۳۸ ﴿وَاٰثَرَ الۡحَيٰوةَ الدُّنۡيَا ﴿۳۸﴾﴾ ''اور دنیا کی زندگی کو ترجیح دی تھی۔''

آیت ۳۹ ﴿فَاِنَّ الۡجَحِيۡمَ هِىَ الۡمَاۡوٰى ﴿۳۹﴾﴾ ''تو یقیناً اُس کا ٹھکانہ اب جہنّم ہی ہے۔''

ایک بندۂ مؤمن کو چاہیے کہ یہ تین آیات ہمیشہ کے لیے اپنی گرہ میں باندھ لے اور اپنی عملی زندگی میں ان کے مفہوم اور پیغام کو اپنے دل و دماغ میں ہر وقت مستحضر رکھے۔ طغٰی کے معنی ہیں: کسی کا اپنی حدود سے تجاوز کرنا۔ اسی معنی میں ہمارے ہاں طغیانی کا لفظ معروف ہے اور اسی مفہوم میں اس مادہ سے لفظ ''طاغوت'' مشتق ہے۔ چنانچہ ان آیات کے پیغام کا خلاصہ یہ ہے کہ انسان کو بنیادی طور پر اللہ تعالیٰ نے اپنی بندگی کے لیے پیدا کیا ہے: ﴿وَمَا خَلَقۡتُ الۡجِنَّ وَالۡاِنۡسَ اِلَّا لِيَعۡبُدُوۡنِ ﴿۵۶﴾﴾ (الذّٰریٰت) یعنی جنوں اور انسانوں کو اللہ تعالیٰ نے پیدا ہی اس لیے کیا ہے کہ وہ اس کے ''بندے'' بن کر رہیں۔ اب جب کوئی انسان 'بندگی' کی حدود سے آگے بڑھ کر اللہ تعالیٰ کے مقابلے میں اپنے 'قانون' اپنے اختیار اور اپنی مرضی کی بات کرے گا تو وہ ''بندے'' کے بجائے ''طاغوت'' بن جائے گا۔ چنانچہ جو 'بندہ' بندگی کی حدود سے تجاوز کر کے طاغوت بن گیا اور پھر اس نے اپنی سوچ' اپنی مرضی' اپنی منصوبہ بندی اور اپنے فیصلوں میں آخرت کے مقابلے میں دنیا کو ترجیح دینے کی روش اپنا لی تو آخرت میں اس کے لیے جہنّم کے علاوہ اور کچھ نہیں ہو گا۔

آیت ۴۰ ﴿وَاَمَّا مَنۡ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ﴾ ''اور جو کوئی ڈرتا رہا اپنے ربّ کے حضور کھڑا ہونے (کے خیال) سے''

سورۃ الحاقہ میں اس پیشی کی کیفیت یوں بیان کی گئی ہے: ﴿يَوۡمَئِذٍ تُعۡرَضُوۡنَ لَا تَخۡفٰى مِنۡكُمۡ خَافِيَةٌ ﴿۱۸﴾﴾ ''جس دن تم پیش کیے جاؤ گے تمہاری کوئی مخفی سے مخفی شے بھی چھپی نہیں رہے گی۔''

﴿وَنَهَى النَّفۡسَ عَنِ الۡهَوٰى ﴿۴۰﴾﴾ ''اور اُس نے روکے رکھا اپنے نفس کو خواہشات سے۔''

اس نے اپنی زندگی میں اپنے نفس کی باگیں ہمیشہ کھینچ کر رکھیں اور غلط خواہشات کے

معاملے میں اسے منہ زوری نہ کرنے دی۔

آیت ۴۱ ﴿فَاِنَّ الۡجَنَّةَ هِیَ الۡمَاۡوٰی ﴿۴۱﴾﴾ ’’تو یقیناً اُس کا ٹھکانہ جنّت ہی ہے۔‘‘

اَللّٰهُمَّ رَبَّنَا اجۡعَلۡنَا مِنۡهُمۡ ' اَللّٰهُمَّ رَبَّنَا اجۡعَلۡنَا مِنۡهُمۡ ۔آمین!

آیت ۴۲ ﴿یَسۡـَٔلُوۡنَكَ عَنِ السَّاعَةِ اَیَّانَ مُرۡسٰهَا ﴿۴۲﴾﴾ ’’(اے نبی ﷺ!) یہ لوگ آپ سے پوچھتے ہیں قیامت کے بارے میں کہ وہ کب آ کر ٹھہرے گی؟‘‘

آیت ۴۳ ﴿فِیۡمَ اَنۡتَ مِنۡ ذِكۡرٰىهَا ﴿۴۳﴾﴾ ’’آپؐ کا کیا تعلق ہے اس کے بیان کرنے سے؟‘‘

آپ ﷺ کو اس لیے تو نہیں بھیجا گیا کہ آپؐ قیامت کے دن اور تاریخ کا تعین کر کے انہیں بتائیں‘ بلکہ آپؐ تو بشیر و نذیر بنا کر بھیجے گئے ہیں۔

آیت ۴۴ ﴿اِلٰی رَبِّكَ مُنۡتَهٰىهَا ﴿۴۴﴾﴾ ’’اس کا انجام تو آپ کے رب ہی کی طرف ہے۔‘‘

یہ معاملہ تو آپؐ کے رب ہی کے حوالے ہے۔ اُس کے علاوہ اور کوئی نہیں جانتا کہ قیامت کب آئے گی۔

آیت ۴۵ ﴿اِنَّمَاۤ اَنۡتَ مُنۡذِرُ مَنۡ یَّخۡشٰىهَا ﴿۴۵﴾﴾ ’’آپؐ تو بس خبردار کرنے والے ہیں‘ ہر اُس شخص کو جو اس سے ڈرتا ہو۔‘‘

جو لوگ قیامت کے تصوّر سے ڈرتے ہوں یا جو اس کے ذکر سے ڈر جائیں آپؐ انہیں خبردار کرتے رہیں‘ آپؐ کے خبردار کرنے سے ایسے لوگوں کا خوف اور تقویٰ مزید بڑھے گا۔ ظاہر ہے جس شخص کی روح میں زندگی کی کوئی رمق موجود ہے اس کے دل میں قیامت کے ذکر سے ضرور خشیت پیدا ہوگی۔

آیت ۴۶ ﴿كَاَنَّهُمۡ یَوۡمَ یَرَوۡنَهَا لَمۡ یَلۡبَثُوۡۤا اِلَّا عَشِیَّةً اَوۡ ضُحٰىهَا ﴿۴۶﴾﴾ ’’جس دن وہ اسے دیکھیں گے (انہیں یوں لگے گا) گویا وہ نہیں رہے (دنیا میں) مگر ایک شام یا اس کی ایک صبح۔‘‘

قیامت کے دن انسان جب اپنی دنیوی زندگی کو یاد کرے گا تو اسے اپنی پوری زندگی ایسے نظر آئے گی جیسے وہ ایک دن کی بھی صرف چند گھڑیاں دنیا میں رہا تھا۔ ❁❁❁

تنظیمِ اسلامی

کی اساسی دعوت

تجدیدِ ایمان	توبہ	تجدیدِ عہد

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡۤا اٰمِنُوۡا بِاللّٰهِ وَرَسُوۡلِهٖ وَالۡكِتٰبِ الَّذِیۡ نَزَّلَ عَلٰی رَسُوۡلِهٖ

(النسآء:۱۳۶)

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا تُوۡبُوۡۤا اِلَی اللّٰهِ تَوۡبَةً نَّصُوۡحًا ؕ

(التحریم:۸)

وَاذۡكُرُوۡا نِعۡمَةَ اللّٰهِ عَلَیۡكُمۡ وَمِیۡثَاقَهُ الَّذِیۡ وَاثَقَكُمۡ بِهٖۤ ۙ اِذۡ قُلۡتُمۡ سَمِعۡنَا وَاَطَعۡنَا

(المآئدہ:۷)

وَاَوۡفُوۡا بِعَهۡدِیۡۤ اُوۡفِ بِعَهۡدِكُمۡ ۚ وَاِیَّایَ فَارۡهَبُوۡنِ

(البقرۃ:۴۰)

سالانہ اجتماع کے مقاصد
اور
ان کے حصول کا طریقہ

بانیٔ تنظیم اسلامی کے ایک فکر انگیز خطاب سے ماخوذ

تنظیم اسلامی کے نویں سالانہ اجتماع منعقدہ ۲۵ مئی تا ۲۹ مئی ۱۹۸۴ء کے موقع پر بانیٔ تنظیم نے رفقاء سے جو مفصل افتتاحی خطاب ارشاد فرمایا تھا‘ اس میں جہاں دیگر بہت سے اہم ملی و ملکی اور تنظیمی و جماعتی موضوعات کا جامعیت کے ساتھ احاطہ کیا وہاں اجتماع کے مقاصد پر بھی وضاحت سے روشنی ڈالی۔ ذیل میں ہم بانیٔ محترم کی گفتگو کے اس حصے کو معمولی سے حک و اضافے کے ساتھ پیش کر رہے ہیں جس میں انہوں نے اجتماع کے مقاصد کے حوالے سے گفتگو فرمائی تھی۔ اس لیے کہ اجتماع کے جو مقاصد اُس وقت تھے وہی آج بھی ہیں۔ (ادارہ)

اس اجتماع کے چار اہم مقاصد ہیں جو ہم میں سے ہر شخص کے سامنے شعوری طور پر رہنے چاہئیں۔

(۱) جذبۂ تازہ کا حصول

جب ہم یہاں سے جائیں تو جذبۂ تازہ لے کر جائیں۔ ہمارے اندر ایک نئی لگن پیدا ہو جائے۔ جہاں تک جذبے کا تعلق ہے تو اس کا تمام تر دارومدار ایمان پر ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ یقین جتنا گہرا ہوگا‘ اللہ تعالیٰ کے ہاں محاسبہ کا خوف جتنا زیادہ دامن گیر ہوگا اور اللہ تعالیٰ کی محبت دلوں میں جس قدر بڑھتی جائے گی‘ اس کی رضا جوئی کے لیے

تن من دھن لگانے کا جذبہ بھی اسی قدر بڑھتا چلا جائے گا۔

دل میں ایمانِ حقیقی جاگزیں ہو چکا ہو تو انسان بڑی سے بڑی قربانی کے لیے آمادہ ہو جاتا ہے۔ دلوں پر بھی زنگ آ جایا کرتا ہے اور اس کے نتیجے میں ایمانی کیفیات دھندلانے لگتی ہیں۔ چنانچہ نبی اکرم ﷺ ارشاد فرماتے ہیں:

((اِنَّ هٰذِهِ الْقُلُوْبَ تَصْدَأُ كَمَا يَصْدَأُ الْحَدِيْدُ اِذَا اَصَابَهُ الْمَاءُ)) قِيْلَ: يَارَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ وَمَا جِلَاءُهَا؟ قَالَ: ((كَثْرَةُ ذِكْرِ الْمَوْتِ وَتِلَاوَةُ الْقُرْآنِ)) (رواہ البیہقی)

یعنی بنی آدم کے قلوب بھی اسی طرح زنگ آلود ہو جاتے ہیں جیسے لوہا پانی پڑنے سے۔ دریافت کیا گیا: یا رسول اللہ ﷺ! اس زنگ کا علاج کیا ہے؟ فرمایا: ”موت کی بکثرت یاد اور قرآن مجید کی تلاوت۔“

صحابہ کرام ؓ نے بہت ہی عملی سوال کیا۔ ان حضرات کا بالعموم انداز ہی یہ ہوتا تھا کہ وہ زیادہ علمی نوعیت کے مسئلوں میں نہیں پڑا کرتے تھے۔ ان کا یہ تجربہ تھا کہ تلواروں پر زنگ آ جائے تو صیقل کر لیا جاتا ہے۔ چنانچہ انہوں نے دریافت کیا کہ دلوں کے زنگ کو کس چیز سے دور کیا جائے! دلوں کی ویران دنیا پھر سے کیسے آباد ہو جائے کہ جذبۂ ایمانی جھلملا اٹھے؟ آپ ﷺ نے جواباً دو چیزوں کا ذکر فرمایا: ایک موت کی بکثرت یاد کہ یہ احساس رہے کہ یہاں رہنا نہیں ہے بلکہ ایک دن یہاں سے جانا ہے۔ گویا یہ دنیا ہماری منزل نہیں ہے بلکہ راہ گزر ہے۔ اس ضمن میں حضور اکرم ﷺ کے یہ الفاظ بھی نہایت جامع ہیں جو آپؐ نے حضرت عبداللہ بن عمر ؓ کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر ان سے فرمائے تھے: ((كُنْ فِي الدُّنْيَا كَأَنَّكَ غَرِيْبٌ أَوْ عَابِرُ سَبِيْلٍ)) (رواہ البخاری والترمذی) یعنی ”دنیا میں ایسے رہو جیسے اجنبی یا راہ چلتا مسافر!“

دوسری چیز جس کا آپ ﷺ نے باہتمام ذکر فرمایا‘ وہ ہے تلاوتِ قرآن۔ گویا اس زنگ کو اتارنے کے لیے یہ دو بہت ہی مؤثر ذریعے ہیں۔ اس اجتماع کا پہلا مقصد یہ ہوا کہ ان پانچ دنوں میں ہم نے اس زنگ کو اتارنا ہے جس کی وجہ سے ہمارا جذبہ سرد پڑ رہا

ہے۔گویا کہ بیٹری کو ’’ری چارج‘‘ کرنا ہے۔

آپ لوگ اگر پورے صبر اور ہمت کے ساتھ مشکلات کو جھیلتے ہوئے خوش دلی سے اجتماع کے پروگراموں میں شریک رہیں تو ان شاء اللہ کسی نہ کسی درجے میں یہ مقصود ضرور حاصل ہوگا اور آپ اپنے جذباتِ ایمانی میں حرارت اور تازگی محسوس کریں گے۔

(۲) مقصد اور طریقِ کار کا شعور

ہمارے سامنے اپنے مقصد اور طریقہ کار کا شعور نکھر کر آئے اور مزید اُجاگر ہو‘ اس لیے کہ جس طرح دلوں پر زنگ آجایا کرتا ہے ایسے ہی ذہن بھی زنگ آلود ہو جایا کرتے ہیں۔ بعض دفعہ انسان محسوس کرتا ہے کہ ذہن پر بھی کچھ غبار سا آ گیا ہے‘ جس کے نتیجے میں فکر کے خدوخال دھندلانے لگتے ہیں۔ اس زنگ کو اتارنے کے لیے اپنے مقصد اور طریق کار کا شعور ہونا ضروری ہے۔ انسان سوچتا ہے کہ ہماری اِس دُنیوی جدّوجُہد کا ہدف کیا ہے‘ ہم کس طرف جا رہے ہیں! یہ صورت ہرگز نہیں ہونی چاہیے کہ ع ’’آہ وہ تیرِ نیم کش‘ جس کا نہ ہو کوئی ہدف!‘‘ اگر کیفیت یہ ہو تو گویا بہت ہی مایوس کن علامت ہے۔ اس کے معنی یہ ہوں گے کہ کچھ لوگ کام تو کر رہے ہیں لیکن انہیں یہ شعور نہیں کہ ہمارا ہدف کیا ہے۔ وہ یہ نہیں جانتے کہ ہمارے اس سفر کی منزل کون سی ہے۔

مقصد کے شعور کے علاوہ منزل تک پہنچنے کا راستہ کون سا ہے‘ اس کا شعور بھی ذہنوں کے اندر برقرار رہنا چاہیے۔ انسان اس دنیا میں رہتے ہوئے بھانت بھانت کی بولیاں سنتا ہے‘ طرح طرح کے فلسفوں سے اس کو سابقہ پیش آتا ہے۔ مختلف نوعیت کی دعوتیں مختلف جانب سے اس کے کانوں تک پہنچتی ہیں۔ لہٰذا کچھ شکوک وشبہات کا پیدا ہو جانا فطری ہے۔ اس اجتماع کے موقع پر ہمیں اپنے مقاصد کے شعور کے ساتھ ساتھ طریقہ کار کو پورے مراحل ومدارج کے ساتھ ازسرِ نو اُجاگر کرنا ہے۔

(۳) رفقاء کا باہمی تعارف

تیسرا مقصد اس قافلے کے ساتھ چلنے والے ساتھیوں کا باہمی ربط وضبط بڑھانا اور محبتِ قلبی میں اضافہ کرنا ہے۔ کسی بھی اجتماعیت میں رفقاء کا باہمی تعارف بہت ہی اہم ہوتا

ہے۔ اس اجتماع پر اللہ تعالیٰ نے اس اہم ضرورت کو پورا کرنے کا ایک موقع فراہم کر دیا ہے۔ اس وقت ملک کے کونے کونے سے رفقاء تشریف لائے ہوئے ہیں۔ یہ ایک بہت ہی سنہری موقع ہے کہ ہم اپنے ساتھیوں کے ساتھ زیادہ سے زیادہ ربط وضبط بڑھائیں اور ایک دوسرے کا تعارف حاصل کرنے کی کوشش کریں۔ اس دور میں دینی اخوت کو نبھانے کے لیے وقت نکالنا بہت مشکل ہے۔ بقولِ شاعر ؎

بھلا گردش فلک کی چین دیتی ہے کسے انشاؔ
غنیمت ہے کہ ہم صورت یہاں دو چار بیٹھے ہیں!

یہ ایک حقیقت ہے کہ ایسے مواقع ہر روز کہاں ملا کرتے ہیں۔ اس اجتماع میں شکاگو اور ٹورنٹو سے بھی رفقاء آئے ہوئے ہیں‘ جو اپنے اپنے علاقے کی نمائندگی کر رہے ہیں۔

(۴) نظم کی اہمیت کا ادراک

ہمیں نظم وضبط کی اہمیت کا ادراک ہو۔ چونکہ ہم ایک منظم جماعت کے تحت منظم جدّوجُہد کر رہے ہیں‘ لہٰذا اس کام میں نظم کی بہت زیادہ اہمیت ہے۔ اگر اللہ نے چاہا تو مَیں اس موقع پر دروسِ قرآن وحدیث کے ذریعے اس کی اہمیت کو اجاگر کرنے کی کوشش کروں گا۔ نظم کی اہمیت کے ضمن میں جو آیات واحادیث بیان ہوتی ہیں‘ وہ ہر رفیق کے سامنے آئینہ کی طرح ہونی چاہئیں۔ اس نظم وضبط یا ڈسپلن کی اہمیت کے ادراک کا علمی پہلو اپنی جگہ بہت زیادہ اہم ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ ہمیں نظم وضبط کو عمل (practice) میں بھی لانا چاہیے‘ یعنی ہم نظم کے خوگر بن جائیں۔ ہمارا نظم مثالی ہونا چاہیے۔ دیکھنے والے خدانخواستہ ایسا محسوس نہ کریں کہ یہ کوئی منظم جماعت نہیں‘ ایک ہجوم ہے۔ بقول علامہ اقبال ؎

عید آزاداں شکوہِ ملک و دیں
عید محکوماں ہجومِ مومنیں

اس اجتماع کے موقع پر بھی نظم وضبط کا بھرپور مظاہرہ ہونا چاہیے۔ اجتماع کے منتظمین سے اگر کوئی کوتاہی ہو جائے تو ان پر نکیر کرنے کی بجائے خیرخواہی کے جذبے کے ساتھ

ان کی توجہ اس جانب مبذول کرانی چاہیے۔ ہمیں اپنے رفقاء کے بارے میں کسی بھی درجے میں سُوءِ ظن میں مبتلا نہیں ہونا چاہیے۔ یہ نہیں سوچنا چاہیے کہ انہوں نے جان بوجھ کر آپ کے لیے کوئی تکلیف دہ صورتحال پیدا کر دی ہے۔ اس طرح کے کسی بھی خیال کو ذہن میں نہ آنے دیجیے۔ خود آپ لوگوں کی طرف سے کوئی بدنظمی صادر نہ ہو۔ یہ بھی آپ کی تربیت کا ایک اہم حصّہ ہے۔

مقاصد کے حصول کا ذریعہ

پہلے دو مقاصد کے حصول کے لیے ہمارا ذریعہ (source) قرآن ہے‘ جو ہمارا ہادی و رہنما ہی نہیں سرچشمۂ ایمان بھی ہے۔ یہی قرآن ہمیں ان مقاصد کا شعور عطا کرنے والا ہے اور یہی ہمیں ان کے حصول کا طریقِ کار بتانے والا ہے۔ نظمِ جماعت کس طور کا ہو‘ اس کی طرف ہماری رہنمائی کرنے والا بھی یہی قرآن ہے۔ آپ لوگوں کو یہ بات اچھی طرح سمجھ لینی چاہیے کہ جب میں لفظ ’’قرآن‘‘ کہتا ہوں تو اس وقت میرے ذہن میں قرآن متلو کے ساتھ‘ جس کی ہم تلاوت کرتے ہیں اور جو مصحف کی شکل میں ہمارے پاس موجود ہے‘ قرآنِ مجسّم حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ بھی ہوتے ہیں۔ اس لیے کہ قرآن اور ذاتِ رسول ﷺ بریکٹ ہیں۔ میرے نزدیک یہ دونوں ایک دوسرے سے جدا نہیں ہیں۔ اس قرآن کی توضیح وتشریح آپ ﷺ نے اپنے قول سے بھی کی ہے اور اس کے دیے ہوئے مقاصد کے حصول کے لیے ایک عملی جدوجُہد آپ ﷺ نے بالفعل کر کے بھی دکھائی ہے۔ اس عملی جدوجُہد کے تمام مراحل و مدارج ہمیں سیرتِ مطہرہ میں ملتے ہیں۔ گویا یہ دونوں چیزیں ایسی ہیں کہ انہیں ایک دوسرے سے جدا نہیں کیا جاسکتا۔ اس حوالے سے میں آپ کی توجہ سورۃ البیّنۃ کی ابتدائی آیات کی طرف دلانا چاہتا ہوں۔ فرمایا:

﴿لَمْ يَكُنِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ وَالْمُشْرِكِيْنَ مُنْفَكِّيْنَ حَتّٰى تَاْتِيَهُمُ الْبَيِّنَةُ ۝١ رَسُوْلٌ مِّنَ اللّٰهِ يَتْلُوْا صُحُفًا مُّطَهَّرَةً ۝٢ فِيْهَا كُتُبٌ قَيِّمَةٌ ۝٣﴾

’’نہیں تھے وہ لوگ جنہوں نے کفر کیا تھا اہلِ کتاب میں سے اور مشرکین میں سے الگ

ہونے والے (یا باز آنے والے) جب تک کہ ان کے پاس البیّنہ نہ آ جاتی۔ ایک رسول (ﷺ) اللہ کی جانب سے جو تلاوت کرتا ہے پاکیزہ اوراق کی۔ ان میں بڑے مضبوط احکام (تحریر) ہیں۔‘‘

وہ بیّنہ اللہ کی جانب سے ایک رسول ہیں‘ جو ان پاکیزہ صحیفوں کی تلاوت کرتے ہیں۔ گویا رسولؐ اور کتاب مل کر ایک بیّنہ یعنی ایسی روشن دلیل جو حُجتِ قاطع بن جائے‘ کی شکل اختیار کرتے ہیں۔ ہمارے نزدیک تو مقصد کے شعور اور ایمان کی جلا کا واحد ذریعہ ہی یہ ہے۔ ہمیں طریق کار اور اس کے مراحل کا شعور بھی وہیں سے حاصل کرنا ہے۔

اس اجتماع کا جو تیسرا مقصد ہے‘ اس کے حصول کے لیے آپ کو خصوصی طور پر وقت نکالنا ہوگا۔ اپنے نفس کے ناگزیر حقوق کی ادائیگی یعنی کھانے‘ پینے اور بقدرِ ضرورت سونے کے بعد جو وقت بھی فارغ ملے اور ان بھاری بھرکم پروگراموں سے جو وقت بچ جائے اسے غنیمت سمجھتے ہوئے اس مقصد کے حصول کے لیے صرف کریں۔ یہ اس وقت کا بہترین مصرف ہوگا۔ ایک مختصر سا تعارف تو آپ کو رفقاء کے سینوں پر آویزاں بیجوں (badges) سے حاصل ہو جائے گا‘ لیکن اس کے علاوہ اپنے رفقاء کے حالات معلوم کرنا اور ان سے ذاتی تعلق بڑھانا بھی ضروری ہے۔ گویا فارغ اوقات میں آپ اپنے ہم مقصد ساتھیوں کا تفصیلی تعارف حاصل کریں تا کہ باہم محبّت میں اضافہ ہو۔

اللہ کی خاطر باہم محبّت رکھنے والوں کے لیے بشارتیں

کسی بھی اجتماعیت کے لیے آپس کا میل جول اور باہمی محبت بہت ہی ضروری ہوتی ہے۔ ہماری اس چھوٹی سی اجتماعیت میں اخوتِ باہمی کی فضا پیدا ہونی چاہیے۔ اس حوالے سے ان احادیث مبارکہ کو ذہن میں رکھیے کہ جن میں رسول اللہ ﷺ نے ان مومنین کے لیے جو دین کی خاطر ایک دوسرے سے محبت رکھتے ہوں‘ بشارتیں سنائی ہیں۔ چنانچہ حضرت معاذ بن جبل ؓ سے روایت ہے‘ وہ کہتے ہیں کہ مَیں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ ارشاد فرماتے ہوئے سنا کہ اللہ تعالیٰ یہ فرماتا ہے:

((وَجَبَتْ مَحَبَّتِي لِلْمُتَحَابِّينَ فِيَّ وَالْمُتَجَالِسِينَ فِيَّ وَالْمُتَزَاوِرِينَ

فِيَّ وَالْمُتَبَاذِلِيْنَ فِيَّ)) (رواہ مالک و احمد)

یعنی میری محبت ان لوگوں کے حق میں واجب ہوگئی جو صرف میرے لیے ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں‘ اور جو میری خاطر مل جل کر بیٹھتے ہیں‘ اور جو میرے لیے ایک دوسرے کو ملنے آتے ہیں اور جو میری محبّت میں ایک دوسرے پر خرچ کرتے ہیں۔

اس حدیث مبارکہ میں جو لفظ ’’فِيَّ‘‘ آیا ہے اس کا کوئی مجرد تصوّر اپنے ذہن میں نہ رکھیے۔ یہاں ’’اللہ کے لیے محبت‘‘ کے معنی یہ ہیں کہ اللہ کے دین کے لیے اور اس کے کلمے کی سربلندی کے لیے سردھڑ کی بازی لگانے کا جذبہ۔ گویا غلبۂ دین کے لیے ایک منظم جدّ و جہد ہو رہی ہے‘ ایک قافلہ ہے اور اس کے ساتھ کچھ لوگ شریک ہیں۔ اب اس قافلے میں چلنے والے کچھ پرانے ساتھی ہیں اور کچھ نئے بھی ہیں‘ ان میں سمجھ دار بھی ہیں اور ناسمجھ بھی ہیں۔ اس قافلے کے وہ ہم سفر کہ جو بہت عرصہ پہلے سے شامل ہیں‘ ان پر بہت سے حقائق واضح ہیں جبکہ جو اس قافلے میں نئے ہم سفر ہیں‘ انہیں ابھی بہت سی چیزوں کا شعور نہیں ہے۔ پھر ان میں وہ بھی ہیں جنہیں دوسری تنظیموں اور جماعتوں میں کام کرنے کا کوئی تجربہ سرے سے ہے ہی نہیں۔ اس قافلے میں شامل افراد کو جوڑنے والی چیز ایک مقصد کی لگن اور احساسِ فرض ہے۔ اسی کے تحت یہ قافلہ قدم بقدم آگے بڑھ رہا ہے۔

اب ’’فِيَّ‘‘ کے مفہوم کو سمجھنے کے لیے سورۃ العنکبوت کی آخری آیت بہت مدد و معاون ہوگی۔ فرمایا گیا: ﴿وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا﴾ اس مقام پر ’’فِيْنَا‘‘ کے معنی ہیں: ’’فِي سَبِيْلِنَا‘‘ یعنی جو لوگ ہماری راہ میں‘ ہماری طرف سے عائد کردہ فرائض کی ادائیگی کے ضمن میں مجاہدہ کریں گے‘ ایثار و قربانی اور صبر کا مظاہرہ کریں گے‘ ان سے پختہ وعدہ ہے کہ ہم لازماً انہیں اپنے راستے دکھائیں گے اور ان کے لیے ان راستوں کو کھولتے چلے جائیں گے۔

گویا پہلے انہیں محسوس ہوگا کہ جیسے ان پر راستے کے نشانات پوری طرح واضح نہیں ہیں‘ تاہم فرض کی ادائیگی کے تحت سفر کا آغاز کر دیں گے‘ لیکن اس راستے پر جیسے جیسے آگے بڑھیں گے‘ وہ یہ محسوس کریں گے کہ جیسے کوئی انگلی پکڑ کر چلا رہا ہے اور کوئی ہمارے

سامنے منزل کو دن بدن اجاگر کرتا چلا جا رہا ہے۔

اسی طرح ایک دوسری حدیث مبارکہ میں بھی اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے لیے باہمی محبت کرنے والوں کو خوشخبری سنائی گئی ہے۔ حضرت ابوہریرہ ؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((يَقُوْلُ اللّٰهُ تَعَالٰى يَوْمَ الْقِيَامَةِ: أَيْنَ الْمُتَحَابُّوْنَ بِجَلَالِي؟ الْيَوْمَ أُظِلُّهُمْ فِي ظِلِّي يَوْمَ لَا ظِلَّ إِلَّا ظِلِّي)) (رواہ مسلم ومالک)

یعنی قیامت کے روز اللہ تعالیٰ فرمائے گا کہ: کہاں ہیں وہ لوگ جو میری جلالت شان کے لیے ایک دوسرے سے محبت کرتے تھے؟ آج کے دن مَیں انہیں اپنے سائے میں پناہ دوں گا‘ آج میرے اس سائے کے علاوہ اور کوئی سایہ نہیں ہے! بعض دوسری روایات میں ’’فِيْ ظِلِّ عَرْشِيْ‘‘ کے الفاظ آئے ہیں کہ مَیں انہیں اپنے عرش کے سائے میں جگہ دوں گا‘ لیکن یہاں تو اس درمیانی واسطے کو بھی علیحدہ کر کے ’’ظِلِّي‘‘ یعنی اپنے سایۂ رحمت میں جگہ دوں گا‘ کا اسلوب اختیار کیا گیا ہے۔

احادیث میں وارد شدہ ان بشارتوں کو سامنے رکھ کر اپنے فارغ اوقات کو باہمی تعارف اور میل جول میں صرف کیجیے۔ اس کام میں جو وقت بھی صرف ہو‘ اسے نہایت قیمتی سمجھیے کہ یہ ہرگز رائیگاں جانے والا نہیں ہے۔

مجھے قوی امید ہے کہ اگر آپ ان چار مقاصد کو سامنے رکھ کر پوری دلچسپی‘ انہماک اور نظم و ضبط کے ساتھ اجتماع کے پروگراموں میں شریک ہوں گے تو نہ صرف یہ کہ طریقِ کار اور منہج عمل کے بارے میں اگر کوئی ابہام آپ اپنے ذہنوں میں لے کر آئے تھے وہ ازخود رفع ہو جائے گا بلکہ آپ ایک ولولۂ تازہ کے ساتھ اس اجتماع سے رخصت ہوں گے۔ اَللّٰهُمَّ وَفِّقْنَا لِهٰذَا!

❁❁❁

علّامہ اقبال اور کتابِ زندہ

ڈاکٹر اسرار احمدؒ

پاکستان میں بسنے والا ہر مسلمان‘ قطع نظر اس سے کہ وہ عوام میں سے ہو یا خواص میں سے‘ بالکل اَن پڑھ اور جاہل ہو یا عالم و فاضل‘ علّامہ اقبال کے ساتھ سہ گانہ رشتوں میں منسلک ہے۔ پہلا یہ کہ یہ مملکتِ خداداد سرزمین پاکستان جس میں ہم ایک آزاد اور خودمختار قوم کی حیثیت سے رہ رہے ہیں‘ اس کا وجود و قیام علّامہ ہی کے تخیل و تصوّر کا مرہونِ منّت ہے۔ دوسرے یہ کہ وہ عالمی ملّتِ اسلامیہ اور اُمّتِ مُسلمہ جس سے ہم سب منسلک ہیں‘ اس کی عظمت وسطوتِ پارینہ کا سب سے بڑا مرثیہ خواں اور اس کے احیاء و نشاۃِ ثانیہ کا سب سے بڑا ترجمان اور حُدی خواں بھی اقبال ہی ہے۔ تیسرے یہ کہ وہ دینِ حق جس کے ہم سب نام لیوا ہیں اور جس کے بارے میں حالی مرحوم نے کہا تھا؎

جو دین بڑی شان سے نکلا تھا وطن سے
پردیس میں وہ آج غریب الغرباء ہے!

اِس دور میں خصوصاً جدید تعلیم یافتہ طبقے میں اس دین کے اسرار و رموز کا سب سے بڑا رازدان بھی اقبال ہی ہے اور اس کی روحِ باطنی اور جسدِ ظاہری دونوں کے تجدید و احیاء کے عظیم ترین نقیب کی حیثیت بھی اسی کو حاصل ہے۔

یہ سہ گانہ تعلق تو علّامہ مرحوم کے ساتھ ہر پاکستانی مسلمان کا ہے۔ مجھے ذاتی طور پر ایک چوتھی خصوصی نسبت روحِ اقبال سے حاصل ہے۔ مجھ پر یہ حقیقت پوری طرح آشکار ہو چکی ہے کہ احیائے اسلام کی شرطِ لازم تجدیدِ ایمان ہے جبکہ ایمان کا اصل منبع اور سرچشمہ قرآن حکیم ہے۔ گویا ملّتِ اسلامیہ کی نشاۃِ ثانیہ اور تشکیلِ جدید کی کوشش ہو یا احیائے

اسلام اور غلبۂ دینِ حق کی جدّوجُہد‘ دونوں کا اصل منبع و مدار اسی پر وابستہ ہے کہ قرآن حکیم کے ساتھ مسلمانوں کا تعلق صحیح طور سے دوبارہ استوار ہو جائے اور اس حقیقی نسبت کی تجدید کی جائے جو ایک مسلمان اور قرآن کے مابین ہونی چاہیے۔ میرے خیال میں ملّتِ اسلامیہ اور دینِ حق دونوں کے احیاء اور نشاۃِ ثانیہ کے لیے مسلمانوں کے قرآن حکیم کے ساتھ وابستہ ہونے کا احساس دورِ حاضر میں علّامہ اقبال سے زیادہ کسی کو نہ تھا۔ اگرچہ علّامہ اقبال بنیادی طور پر سیاست دان نہ تھے لیکن اس کے باوجود انہوں نے برصغیر پاک و ہند کے مسلمانوں کے مستقبل کے بارے میں جو کچھ سوچا اور ان کے مسائل کا جو حل پیش کیا وہ ان کی بیدار مغزی‘ معاملہ فہمی اور سیاسی تدبّر کا شاہکار ہے۔ ۱۹۳۰ء سے قبل ہندوستان کی تقسیم کا خیال تک کسی کے ذہن میں نہیں آ سکتا تھا۔ یہ صرف علّامہ مرحوم کی نگاہِ دُوررس و دُوربین تھی جس نے حالات کے رخ اور زمانے کی رفتار کو پہچان کر مسلمانانِ ہند کے جملہ مسائل کا یہ حل بتایا کہ ہندوستان کے کم از کم شمال مغربی گوشے میں واقع مسلم اکثریتی علاقوں پر مشتمل مسلمانوں کی ایک آزاد اور خودمختار مملکت قائم کی جائے۔

پاکستان کے ساتھ علّامہ کا تعلق صرف ’’مصوّر‘‘ ہی کا نہیں بلکہ اس سے کہیں زیادہ ہے۔ ان کی نگاہِ دُوررس نے مسلمانانِ ہند کے قومی مقدمے کی پیروی اور ان کی قیادتِ عظمیٰ کے لیے صحیح ترین وکیل اور قائد کی حیثیت سے محمد علی جناح کو ڈھونڈ نکالا۔ قائداعظم کا انتخاب بلاشبہ علّامہ اقبال کے خلوص و اخلاص کا واضح ثبوت اور ان کے انکسار اور تواضع کی روشن دلیل ہے۔ علّامہ اقبال نے صرف پاکستان کا تصور ہی پیش نہیں کیا بلکہ اس خاکے میں رنگ بھرنے کی عملی جدّوجُہد کے ابتدائی مراحل میں بھی قائدانہ حیثیت سے شرکت کی۔ اس اعتبار سے علّامہ کا ایک عظیم احسان ہر اس مسلمان کی گردن پر ہے جو پاکستان کی فضا میں ایک آزاد شہری کی حیثیت سے سانس لے رہا ہے۔ افسوس کہ ہم نے بحیثیت قوم پاکستان ہی کی قدر نہیں کی‘ کجا کہ علّامہ اقبال کے اس عظیم احسان کو یاد رکھتے! کاش کہ ہم کو معلوم ہوتا کہ آزادی اللہ تعالیٰ کی کتنی بڑی نعمت ہے اور اس مملکتِ خداداد پاکستان کا

معجزانہ قیام اللہ تعالیٰ کا کتنا بڑا احسان ہے۔ اسی صورت میں ہمیں علامہ کے ذاتی احسان کا بھی کوئی احساس ہو سکتا تھا مگر ؎

وائے ناکامی متاعِ کارواں جاتا رہا
کارواں کے دل سے احساسِ زیاں جاتا رہا

ہماری اسی ناقدری کے نتیجے میں پاکستان کا مشرقی حصّہ ہم سے علیحدہ ہو گیا۔ اس دردناک حادثہ فاجعہ پر بھارت میں جس طرح خوشی منائی گئی اور اسے جس طرح ''ہزار سالہ غلامی کے انتقام'' سے تعبیر کیا گیا اس سے ان لوگوں کی آنکھیں کھل جانی چاہئیں جو ہندوؤں کے بارے میں کسی حسنِ ظن میں مبتلا تھے' اور ہیں۔ اگر مسز اندرا گاندھی اس نہرو خاندان کی بیٹی ہوتے ہوئے جس کی وسیع المشربی ضرب المثل ہے' یہ الفاظ اپنی زبان سے نکال سکتی ہے تو ع ''قیاس کن زگلستانِ من بہارِ مرا'' کے مصداق سوچنے کی بات ہے کہ فرقہ پرست اور متعصب مزاج ہندو اکثریت کو ایک بار ہندوستان میں فیصلہ کن اقتدار حاصل ہو جاتا تو اس کا رویہ مسلمانوں کے ساتھ کیا ہوتا!

علامہ اقبال عالمی ملّتِ اسلامیہ کے ترجمان و حُدی خواں کی حیثیت سے بھی سامنے آتے ہیں۔ چنانچہ ؎

چین و عرب ہمارا ہندوستاں ہمارا
مسلم ہیں ہم وطن ہے سارا جہاں ہمارا

کا وجد آفریں ترانہ انہی کی زبان پر جاری ہوا۔ علامہ کی ملّی شاعری میں مرثیہ خوانی کا رنگ بھی موجود ہے اور حُدی خوانی کا نوحہ بھی۔ انہوں نے بیک وقت شبلی اور حالی دونوں کی جانشینی کا فرض ادا کیا۔ ملّتِ اسلامیہ کے شاندار اور تابناک ماضی کی یاد سے بھی دلوں کو گداز کیا اور اُمّت مرحومہ کی موجودہ زبوں حالی کا نقشہ بھی نہایت مؤثر اور دل دوز انداز میں کھینچا۔ علامہ کی ملی شاعری کا مثبت اور تعمیری پہلو انہیں ملت کے دوسرے مرثیہ خوانوں سے ممتاز کرتا ہے۔ چنانچہ اقبال کے ہاں صرف درد انگیز نالے ہی نہیں ہیں' انتہائی ولولہ انگیز پیغامِ عمل بھی ہے۔ سب سے بڑھ کر ایک شاندار مستقبل کی خوشخبری بھی موجود

ہے جس نے ''یاس'' اور ''قنوطیت'' کی ظلمت کا پردہ چاک کر کے دلوں میں اُمید کے چراغ روشن کر دیے۔ علامہ کے اشعار میں یہ اُمید افزا پیغام رچا بسا ہوا ہے۔ فرماتے ہیں ؎

نکل کے صحرا سے جس نے روما کی سلطنت کو اُلٹ دیا تھا
سنا ہے یہ قدسیوں سے مَیں نے وہ شیر پھر ہوشیار ہو گا

اور ؎

اقبال کا ترانہ بانگِ درا ہے گویا
ہوتا ہے جادہ پیما پھر کارواں ہمارا

علامہ کی ملّی شاعری جغرافیے کی حدود سے بالکل آزاد ہے۔ ان کے اشعار کو پڑھتے ہوئے کسی کے حاشیہ خیال میں بھی یہ بات نہیں آ سکتی کہ ان کا قائل کبھی ایک محدود خطۂ ارضی میں بسنے والے مسلمانوں کے خصوصی مسائل کے بارے میں بھی غور و فکر کرتا ہو گا۔ ذرا اندازہ تو کیجیے کہ ایک ہندی مسلمان ارضِ لاہور میں بیٹھا کہہ رہا تھا کہ ؎

طہران ہو گر عالمِ مشرق کا جنیوا
شاید کُرۂ ارض کی تقدیر بدل جائے!

جہاں تک دینِ حق کے اَسرار و رموز اور حقائق و معارفِ ایمانی اور علم و حکمتِ قرآنی کی ترجمانی کا تعلق ہے' حقیقت یہ ہے کہ اس نسبت سے علامہ اقبال رومیٔ ثانی تھے۔ انہوں نے مولانا روم کو اپنا شیخ تسلیم کیا اور ''پیرِ رومی'' کے ساتھ بحیثیت ''مریدِ ہندی'' ان کے مکالمات ان کے کلام کی زینت ہیں' بلکہ ایک مقام پر انہوں نے اپنی اس نسبت کا ذکر فخریہ انداز میں بھی کیا ہے ع ''برہمن زادۂ رمز آشنائے روم و تبریز است!''

علامہ اقبال دورِ حاضر کے ''ترجمان القرآن'' قرار دیے جانے کے مستحق ہیں۔ علامہ خود بھی اس کے مدعی تھے کہ ان کے اشعار پیغامِ قرآنی ہی کی ترجمانی پر مشتمل ہیں اور اس پر انہیں اس درجہ وثوق اور اعتبار ہے کہ انہوں نے ''مثنوی اسرار و رموز'' کے آخر میں ''عرضِ حالِ مصنف بحضور رحمۃ للعالمین ﷺ'' کے ذیل میں یہاں تک لکھ دیا کہ ؎

گر دلم آئینۂ بے جوہر است
ور بحرفم غیرِ قرآں مضمر است
پردۂ ناموسِ فکرم چاک کُن
ایں خیاباں را ز خارم پاک کُن!
روزِ محشر خوار و رسوا کُن مرا
بے نصیب از بوسۂ پا کُن مرا!

''اگر میرے دل کی مثال اُس آئینے کی سی ہے جس میں کوئی جوہر ہی نہ ہو اور اگر میرے پیغام میں قرآن کے سوا کسی اور شے کی ترجمانی ہے تو اے نبیؐ آپ میرے فکر کے ناموس کا پردہ خود چاک فرما دیں اور اس چمن کو مجھ جیسے خار سے پاک کر دیں۔ یہاں تک کہ حشر کے دن مجھے ذلیل اور رسوا کر دیجیے اور اپنی قدم بوسی کی سعادت سے محروم فرما دیجیے۔''

دینِ حق کی جو تشریح علامہ اقبال کے کلام میں نظر آتی ہے‘ بغرضِ تفہیم اس کے تین اجزاء ہیں۔ یہ تینوں اجزاء درحقیقت ایک ہی مرکزی نکتے ''توحید'' کی شرح کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ع ''یہ سب کیا ہیں؟ فقط اِک نکتۂ ایماں کی تفسیریں!''

اوّلاً تمدنی اور معاشرتی سطح پر وحدتِ خالق ہی وہ اساسی تصور ہے جس سے وحدتِ انسانیت کا نظریہ جنم لیتا ہے۔ اس میں مزید گہرائی وحدتِ آدم کے تصور سے پیدا ہوتی ہے اور نتیجتاً انسانی حریت واخوت ومساوات کے اصول مستنبط ہوتے ہیں۔ چنانچہ بحیثیت نظامِ زندگی‘ علامہ کے کلام میں اسلامی تعلیمات پر بہت زور دیا گیا ہے۔ مردِ مؤمن کی شان میں فرماتے ہیں۔

تمیزِ بندہ و آقا فسادِ آدمیت ہے
حذر اے چیرہ دستاں سخت ہیں فطرت کی تعزیریں!

اسی طرح سیاسی سطح پر توحیدِ الٰہی کے تصور سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ حاکمیت صرف اللہ ربّ العزت کے لیے ہے‘ جب کہ عوام کی حاکمیت پر مبنی سیاسی نظام مجسّم شرک اور کفر

ہے۔ کتنے سادہ لیکن پُرشکوہ الفاظ میں علامہ نے فرمایا۔

سروری زیبا فقط اُس ذاتِ بے ہمتا کو ہے
حکمراں ہے اِک وہی باقی بتانِ آزری!

ثانیاً حاکمیت کے بعد قومیت کا تصور سامنے آتا ہے۔ چنانچہ موجودہ زمانے میں وطنی قومیت کا جو تصور پوری دنیا میں رائج ہے‘ حیرت ہوتی ہے کہ علامہ نے اس کی برائی کا احساس کس شدت سے کیا اور اس شجرِ خبیثہ کی خباثت کا کس قدر صحیح اندازہ لگایا۔ فرماتے ہیں۔

اِن تازہ خداؤں میں بڑا سب سے وطن ہے
جو پیرہن اس کا ہے وہ مذہب کا کفن ہے
یہ بت کہ تراشیدۂ تہذیبِ نوی ہے
غارت گرِ کاشانۂ دینِ نبویؐ ہے
بازو ترا توحید کی قوت سے قوی ہے
اسلام ترا دیس ہے تُو مصطفوی ہے!
نظارۂ دیرینہ زمانے کو دکھا دے
اے مصطفوی خاک میں اس بُت کو ملا دے!

یہی معاملہ نظامِ معیشت کا بھی ہے۔ توحید کا اصول جس طرح حاکمیت اور قومیت کے تمام مروّجہ وموجودہ تصورات کی کلی نفی کر دیتا ہے‘ اسی طرح اس میں ملکیتِ مطلقہ کے مقبولِ عام تصور کی بھی کامل نفی موجود ہے۔ اگر ''مُلک'' اللہ کا ہے تو ''مِلک'' بھی اللہ ہی کی ہے‘ اور اگر زمین وآسمان اور جو کچھ ان دونوں میں ہے اس سب کا مَلِک یعنی بادشاہ اللہ ہے تو یقیناً ان کا ''مالک'' بھی وہی ہے۔

اس دور میں علّامہ کی شخصیت عظمتِ قرآن کے ایک عظیم نشان کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس لیے کہ ایک عام آدمی کا مذہبی عقیدے کے طور پر قرآن مجید کو اللہ کی کتاب ماننا اور بات ہے‘ جبکہ ایک ایسے شخص کا قرآن پر وثوق واعتماد اور ایمان ویقین دوسری بات ہے

جوفکرِ انسانی کی تمام وادیوں میں گھوم کر مشرق و مغرب کے تمام فلسفے کھنگال چکا ہو۔ اعجازِ قرآن کے بے شمار پہلو ہیں جن کا احاطہ ہر کسی کے لیے ممکن نہیں۔ اس دور میں اعجازِ قرآن کا عظیم ترین مظہر یہ ہے کہ وہ کتاب جسے دنیا کے سامنے آج سے چودہ سو برس قبل حضور ﷺ نے پیش کیا تھا' آج بھی جب کہ مادی علوم انتہائی بلندی کو چھو رہے ہیں اور علم و ہنر کی دنیا میں انقلاب آ چکا ہے' نوعِ انسانی کی ہدایت اور رہنمائی کی جملہ ضرورتوں کو پورا کر سکتی ہے! اس کی گواہی علامہ کی زندگی سے ملتی ہے۔ انہوں نے انیسویں صدی میں شعور کی آنکھ کھولی اور وقت کی اعلیٰ ترین علمی سطح پر تعلیم حاصل کی۔ بالآخر ان کے ذہن کو سکون ملا تو صرف قرآن حکیم سے' اور ان کی علمی پیاس کو آسودگی حاصل ہوئی تو صرف کتاب اللہ سے۔ علامہ فرماتے ہیں ؎

نہ کہیں جہاں میں اماں ملی' جو اماں ملی تو کہاں ملی
مرے جرمِ خانہ خراب کو ترے عفوِ بندہ نواز میں

علامہ جب قرآن کا ذکر کرتے ہیں تو صاف محسوس ہوتا ہے کہ ع ''قلندر ہرچہ گوید دیدہ گوید'' کے مصداق وہ فی الواقع جمال و جلالِ قرآنی کا مشاہدہ اپنے قلب کی گہرائیوں سے کر رہے ہیں۔ جو کچھ کہہ رہے ہیں وہ شنید نہیں' دید ہی پر مبنی ہے' بلکہ بسا اوقات ایسے محسوس ہوتا ہے جیسے ان کا وجودِ فکری کلامِ پاک کی عظمت کے بارِ گراں سے ''خَاشِعًا مُّتَصَدِّعًا'' ہوا جا رہا ہے۔ عظمتِ قرآنی کا یہ احساس و ادراک ان کے ریشے ریشے میں سرایت کیے ہوئے ہے اور ان کا ہر شعر قرآن کی جلالت اور رفعت کے ترانے گا رہا ہے۔ مسلمانوں کے زوال و اضمحلال اور اُمتِ مُسلمہ کی ذلت و خواری کا سبب علامہ کے نزدیک قرآن سے دُوری ہے۔ فرماتے ہیں ؎

وہ زمانے میں معزز تھے مسلماں ہو کر
اور تم خوار ہوئے تارکِ قرآں ہو کر!

علامہ کے نزدیک اسی ''کتابِ زندہ'' سے اُمت کا احیاء وابستہ ہے اور اسی پر اُمت کی نشاۃِ ثانیہ کا دارومدار ہے۔ گویا مسلمانوں کی حیاتِ تازہ کا انحصار حقیقتاً مسلمان ہونے

پر ہے اور ان کے مسلمان ہونے کا دارومدار قرآن حکیم پر ہے۔ علامہ کے نزدیک علم نام ہے علمِ قرآنی کا اور حکمت نام ہے حکمتِ قرآنی کا' اور یہی علم و حکمتِ قرآن ہے جو کسی کے ذہن اور قلب میں رچ بس جائے تو اُس کے باطن میں ایک انقلاب برپا ہو جاتا ہے جو بالآخر ایک عالمی انقلاب کو جنم دے سکتا ہے۔ علامہ کے نزدیک ذہن کی تطہیر اور فکر کی تعمیر کا واحد ذریعہ یہ ہے کہ ''اسرارِ دیں'' فاش کیے جائیں اور نوعِ انسانی کے سامنے ''نکتہ ہائے شرعِ مبین'' کی وضاحت کی جائے۔ خود تزکیۂ نفس' تصفیۂ قلب اور تجلیۂ روح کا کارگر اور مؤثر ذریعہ بھی قرآن حکیم ہی ہے۔ پاکستان کے بقا و استحکام' ملّتِ اسلامی کی تجدید و نشاۃِ ثانیہ اور دینِ حق کے احیاء و اظہار جیسے اہم اور جلیل مقاصد کے ضمن میں علامہ اقبال کے فکر اور پیغام کی اشاعت کو بہت اہمیت حاصل ہے اور پاکستانی عوام میں بالعموم اور نوجوان نسل میں بالخصوص جو دُوری رفتہ رفتہ علامہ کی شخصیت اور افکار و نظریات سے پیدا ہوتی جا رہی ہے اسے دور کرنا وقت کی اہم ضرورت بھی ہے اور قومی و ملّی سالمیت کا تقاضا بھی۔ ❁

ہماری ویب سائٹ

www.tanzeem.org

پر ملاحظہ کیجیے:

- ☆ تنظیم اسلامی کا تعارف
- ☆ بانی تنظیم اسلامی محترم ڈاکٹر اسرار احمد کا مکمل دورۂ ترجمۂ قرآن
- ☆ بانی تنظیم اسلامی اور امیر تنظیم اسلامی کے مختلف خطابات
- ☆ تلاوتِ قرآن' دروسِ قرآن' دروسِ حدیث اور خطاباتِ جمعہ
- ☆ صحیح بخاری' صحیح مسلم' موطا امام مالک اور اربعین نوویؒ کے تراجم
- ☆ میثاق' حکمت قرآن اور ندائے خلافت کے تازہ اور سابقہ شمارے
- ☆ اردو اور انگریزی کتابیں
- ☆ آڈیو ویڈیو کیسٹس' سی ڈیز اور مطبوعات کی مکمل فہرست

ضُعفِ ارادہ

سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ

تحریر ہذا مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ کی معروف کتاب ''تحریک اور کارکن'' سے لی گئی ہے' جس میں ایک اسلامی انقلابی جماعت کے کارکنوں کے مطلوبہ اوصاف بیان کرنے کے ساتھ ساتھ ان میں مختلف مواقع پر جو فکری و عملی کمزوریاں دَر آتی ہیں اُن پر قابو پانے کا مؤثر حل پیش کیا گیا ہے۔ اس کتاب کے آخری باب (پنجم) ''اسلامی انقلاب کے لیے کن اوصاف سے آراستہ اور کن عیوب سے مبرا ہونا چاہیے؟'' کے ذیل میں ''وہ نقائص جن کی تاثیر کام کو بگاڑ دیتی ہے'' بیان کیے گئے ہیں' جن میں سے آخری ''ضعفِ ارادہ'' ہے۔ (ادارہ)

ایک اور کمزوری بھی انسانوں میں بکثرت پائی جاتی ہے جسے ہم ''ضعفِ ارادہ'' کا نام دے سکتے ہیں۔

اس کی حقیقت یہ ہے کہ انسان ایک تحریک کی دعوت سن کر اسے صدقِ دل سے لبیک کہتا ہے اور اوّل اوّل خاصا جوش بھی دکھاتا ہے' مگر وقت گزرنے کے ساتھ اس کی دلچسپی کم ہوتی چلی جاتی ہے۔ یہاں تک کہ اسے نہ اس مقصد سے کوئی حقیقی لگاؤ باقی رہتا ہے جس کی خدمت کے لیے وہ آگے بڑھا تھا اور نہ اس جماعت کے ساتھ کوئی عملی وابستگی باقی رہتی ہے جس میں وہ دلی رغبت کے ساتھ شامل ہوا تھا۔ اس کا دماغ بدستور ان دلائل پر مطمئن رہتا ہے جن کی بنا پر اس تحریک کو اُس نے برحق مانا تھا۔ اُس کی زبان بدستور اس کے برحق ہونے کا اقرار کرتی رہتی ہے۔ اس کے دل کی شہادت بھی یہی رہتی ہے کہ ایک کام کرنے کا ہے اور ضرور ہونا چاہیے۔ لیکن اس کے جذبات سرد پڑ جاتے ہیں اور قوائے عمل کی حرکت سُست ہوتی چلی جاتی ہے۔ اس میں کسی بدنیتی کا ذرّہ برابر دخل نہیں ہوتا۔ مقصد سے انحراف بھی نہیں ہوتا۔ نظریے کی تبدیلی بھی قطعاً واقع

نہیں ہوتی۔ اسی وجہ سے آدمی جماعت کو چھوڑنے کا خیال نہیں کرتا۔ مگر بس' وہ ارادے کی کمزوری ہوتی ہے جو ابتدائی جوش ٹھنڈا ہو جانے کے بعد مختلف شکلوں میں اپنے کرشمے دکھانے شروع کر دیتی ہے۔

ضعفِ ارادہ کا ابتدائی ظہور کام چوری کی صورت میں ہوتا ہے۔ آدمی ذمہ داریاں قبول کرنے سے جی چرانے لگتا ہے۔ مقصد کی راہ میں وقت' محنت اور مال خرچ کرنے سے گریز کرنے لگتا ہے۔ دنیا کے ہر دوسرے کام کو اس کام پر ترجیح دینے لگتا ہے جسے وہ زندگی کا نصب العین قرار دے کر آیا تھا۔ اس کے اوقات میں' اس کی محنتوں میں' اس کے مال میں اس کے نام نہاد مقصدِ حیات کا حصّہ کم سے کم ہوتا چلا جاتا ہے اور جس جماعت کو وہ برحق جماعت مان کر اس سے وابستہ ہوا تھا اس کے ساتھ بھی وہ صرف نظم اور ضابطے کا تعلق باقی رکھتا ہے۔ اس کے بھلے اور بُرے سے کوئی غرض نہیں رکھتا' نہ اس کے معاملات میں کسی قسم کی دلچسپی لیتا ہے۔

یہ حالت کچھ اس طرح بتدریج طاری ہوتی ہے جیسے جوانی پر بڑھاپا آتا ہے' مگر آدمی اپنی اس کیفیت پر نہ خود متنبہ ہو اور نہ کوئی اسے متنبہ کرے' تو کسی وقت بھی وہ یہ سوچنے کی ضرورت محسوس نہیں کرتا کہ جس چیز کو مَیں اپنا مقصدِ زندگی قرار دے کر جان و مال کی بازی لگانے کے لیے اٹھا تھا' اس کے ساتھ اب کیا معاملہ کرنے لگا ہوں۔ یوں محض غفلت اور بے خبری کے عالم میں آدمی کی دلچسپی و وابستگی بے جان ہوتی چلی جاتی ہے' حتیٰ کہ کسی روز بے خبری ہی میں اس کی طبعی موت واقع ہو جاتی ہے۔

جماعتی زندگی میں اگر پہلے آدمی کے اندر اس کیفیت کے ظہور کا نوٹس نہ لیا جائے اور اس کی نشوونما کو روکنے کی فکر نہ کی جائے تو ایک ضعیف الارادہ شخص کی چھوت ایسے دوسرے لوگوں کو بھی لگنی شروع ہو جاتی ہے جن کے اندر ضعفِ ارادہ پیدا ہو رہا ہو۔ اونگھتے کو ٹھیلتے کا بہانہ مل جاتا ہے۔ اچھے خاصے سرگرم آدمی دوسروں کو کام نہ کرتے دیکھ کر خود بھی کام چھوڑ بیٹھتے ہیں' اور کوئی اللہ کا بندہ یہ نہیں سوچتا کہ مَیں کسی اور کے لیے نہیں' خود اپنے مقصدِ حیات کی خدمت کے لیے آیا تھا۔ اگر دوسرے اپنا مقصد چھوڑ چکے ہیں تو مَیں اپنے مقصد سے کیوں دست بردار ہو جاؤں۔ ان لوگوں کی مثال اس شخص کی سی ہوتی ہے جو صرف اس لیے جنّت کے راستے پر چلنا چھوڑ دے کہ دوسرے ساتھیوں نے چھوڑ دیا ہے۔ گویا جنّت اُس کی اپنی منزلِ مقصود نہ تھی' یا وہ اس شرط کے ساتھ جنّت

جانا چاہتا تھا کہ دوسرے بھی وہاں جائیں‘ اور شاید دوسروں ہی کے ساتھ وہ جہنم جانے کا ارادہ بھی کر لے اگر انہیں اس طرف جاتے دیکھے‘ کیونکہ اس کا اپنا مقصد کوئی نہیں ہے۔ جو کچھ دوسروں کا مقصد ہے وہی اس کا بھی ہے۔ اس ذہنی کیفیت میں مبتلا ہو جانے والے لوگ ہمیشہ کام نہ کرنے والوں کو مثال بناتے ہیں‘ کام کرنے والوں میں انہیں کوئی قابلِ تقلید مثال نہیں ملتی۔

تاہم‘ بسا غنیمت ہے کہ کوئی شخص بس سیدھے سادھے طریقے پر ضعفِ ارادہ کی بنا پر سُست پڑ جائے اور سُست ہی پڑ کر رہ جائے۔ انسانی فطرت جب ایک دفعہ کمزوری میں مبتلا ہو جاتی ہے تو دوسری کمزوریاں بھی اُبھرنے لگتی ہیں‘ اور کم ہی لوگ اس پر قادر ہوتے ہیں کہ اپنی ایک کمزوری کی مدد پر دوسری کمزوریوں کو نہ آنے دیں۔ بالعموم‘ آدمی کو اس میں شرم محسوس ہوتی ہے کہ وہ اپنے آپ کو ایک کمزور انسان کی حیثیت سے ظاہر کرے‘ یا اسے برداشت کر لے کہ لوگ اسے کمزور سمجھیں۔ وہ سیدھی طرح اس کا اعتراف نہیں کرتا کہ ضعفِ ارادہ نے اسے سُست کر دیا ہے۔ اس کے بجائے وہ اس پر پردہ ڈالنے کے لیے مختلف طریقے اختیار کرتا ہے‘ جن میں سے ہر طریقہ دوسرے سے بدتر ہوتا ہے۔ مثلاً وہ کام نہ کرنے کے لیے طرح طرح کے بہانے کرتا ہے اور آئے دن کوئی نہ کوئی عذرِ لنگ پیش کر کے ساتھیوں کو یہ فریب دینے کی کوشش کرتا ہے کہ اس کے کام نہ کرنے کا اصل سبب مقصد سے لگاؤ اور دلچسپی میں کمی نہیں ہے بلکہ کچھ واقعی رکاوٹیں اس کی راہ میں حائل ہیں۔ یہ گویا سُستی کی مدد پر جھوٹ کو بلانا ہے‘ اور یہاں سے اُس آدمی کا اخلاقی تنزل شروع ہوتا ہے جس نے اوّل اوّل صرف ترقی کی بلندیوں پر چڑھنا چھوڑ دیا تھا۔

یہ حیلہ جب پرانا ہو کر بیکار ثابت ہونے لگتا ہے اور آدمی کو خطرہ ہوتا ہے کہ اب اصل کمزوری کا راز فاش ہوا چاہتا ہے تو وہ یہ ظاہر کرنے کی کوشش کرتا ہے کہ وہ دراصل اپنی کمزوری کی وجہ سے سُست نہیں ہوا ہے‘ بلکہ جماعت کی کچھ خرابیوں نے اسے بددل کر دیا ہے۔ گویا آپ خود تو بہت کچھ کرنا چاہتے تھے مگر کیا کریں‘ ساتھیوں کے بگاڑ نے دل توڑ کر رکھ دیا ہے۔ اس طرح یہ گرتا ہوا انسان جب ایک جگہ قدم نہیں جما سکتا تو اور زیادہ نیچے اتر جاتا ہے اور اپنی کمزوریوں کو چھپانے کی خواہش اسے یہ مظلمہ اپنی گردن پر لینے کے لیے آمادہ کر دیتی ہے کہ جس کام کو بنانے کے قابل وہ نہ رہا تھا‘ اسے اب بگاڑنے کی کوشش شروع کر دے۔

ابتدائی مرحلے میں یہ بددلی کا معاملہ مجمل رہتا ہے۔ کچھ پتہ نہیں چلتا کہ حضرت کیوں

بددل ہیں۔ خرابیوں کی مبہم شکایتیں دبی زبان سے ظاہر ہوتی ہیں‘ مگر ان کی کوئی تفصیل معلوم نہیں ہوتی۔ ساتھی اگر حکمت سے کام لیں اور اصل مرض کو سمجھ کر اس کا مداوا کرنے کی فکر کریں تو یہ گرتا ہوا شخص مزید گرنے سے رُک بھی سکتا ہے اور اوپر اُٹھایا بھی جا سکتا ہے۔ لیکن اکثر نادان دوست‘ کچھ بے جا جوش کی وجہ سے اور کچھ اپنے جذبۂ استعجاب کی تسکین کی خاطر‘ کھوج کُرید شروع کر دیتے ہیں اور اسے اجمال کی تفصیل بیان کرنے پر مجبور کرتے ہیں۔ اس کے بعد وہ اپنی بددلی کو حق بجانب ثابت کرنے کے لیے ہر طرف نظر دوڑاتا ہے‘ مختلف افراد کی انفرادی کمزوریاں چُن چُن کر جمع کرتا ہے‘ جماعت کے نظام اور اس کے کام میں نقائص ڈھونڈتا ہے‘ اور ایک فہرست بنا کر سامنے رکھ دیتا ہے کہ یہ ہیں وہ خرابیاں جنہیں دیکھ دیکھ کر آخر کار یہ خاکسار بددل ہو گیا ہے۔ یعنی اس کا استدلال یہ ہوتا ہے کہ مجھ جیسا مردِ کامل‘ جو سب کمزوریوں سے پاک تھا‘ ان کمزور ساتھیوں اور ان نقائص سے لبریز جماعت کے ساتھ بھلا کس طرح آگے چل سکتا ہے! یہ طرزِ استدلال اختیار کرتے وقت شیطان اسے یہ بات بھلا دیتا ہے کہ اگر واقعی معاملہ یہ تھا تو سُست پڑنے کے بجائے یہ تو اور زیادہ سرگرم ہونے کا متقاضی تھا۔ جس کام کو آپ اپنی زندگی کا نصب العین ٹھہرا کر انجام دینے کے لیے اٹھے تھے‘ اسے اگر دوسرے اپنی خامیوں سے بگاڑ رہے تھے‘ تو آپ اور زیادہ جوش و خروش کے ساتھ اُسے بنانے میں لگ جاتے اور اپنی خوبیوں سے دوسروں کی اُن خامیوں کا تدارک فرماتے۔ آپ کے گھر میں آگ لگی ہو اور گھر کے دوسرے افراد اسے بجھانے میں کوتاہی برتیں تو آپ بددل ہو کر بیٹھ جائیں گے یا جلتے ہوئے گھر کو بچانے کے لیے ان کوتاہ دستوں سے بڑھ کر چابک دستی دکھائیں گے؟

اس معاملے کا سب سے زیادہ افسوس ناک پہلو یہ ہوتا ہے کہ آدمی اپنی غلطی پر پردہ ڈالنے اور اپنے آپ کو حق بجانب ثابت کرنے کی کوشش میں خود اپنے نامۂ اعمال کا سارا حساب دوسروں کے نامۂ اعمال میں درج کر ڈالتا ہے اور بھول جاتا ہے کہ نامہ ہائے اعمال کا کوئی ریکارڈ ایسا بھی ہے جس میں کسی کی مکاری سے ایک شوشہ بھی نہیں بدل سکتا۔ وہ دوسروں کے نامۂ اعمال میں بہت سی ایسی کمزوریاں گنواتا ہے جن میں وہ خود مبتلا ہوتا ہے۔ وہ جماعت کے کردار میں بہت سی اُن خرابیوں کی نشان دہی کرتا ہے جن کے پیدا کرنے میں اُس کا اپنا حصّہ دوسروں سے کم نہیں‘ کچھ زیادہ ہی ہوتا ہے۔ وہ ان کاموں پر سراپا شکایت بنا ہوا نظر آتا ہے جو

اس کے اپنے کیے ہوئے ہوتے ہیں‘ اور جب وہ کہتا ہے کہ یہ کچھ دیکھ کر اس کا دل ٹوٹ گیا ہے تو اس کے معنی صاف یہ ہوتے ہیں کہ ان سب چیزوں سے وہ خود بری الذمہ ہے۔

کوئی انسانی جماعت کمزوریوں سے خالی نہیں ہوتی‘ نہ کوئی انسانی کام نقائص سے پاک ہوتا ہے۔ دنیا میں کبھی ایسا نہیں ہوا اور نہ ہی ہو سکتا ہے کہ انسانی معاشرے کی اصلاح وتعمیر کے لیے فرشتے فراہم ہوں اور سارا کام معیارِ کمال کے مطابق کریں۔ کمزوریاں ڈھونڈیے‘ تو کہاں نہ مل جائیں گی۔ نقائص تلاش کیجیے تو کس جگہ وہ نہ پائے جائیں گے۔ انسانی کام کمزوریوں اور خامیوں کے ساتھ ہی ہوا کرتے ہیں‘ اور معیارِ کمال تک پہنچنے کی ساری کوششوں کے باوجود کسی ایسی حالت پر پہنچنے کی کم از کم اس دنیا میں اُمید نہیں کی جا سکتی جہاں انسان اور اس کا کام سُبُّوح وقُدُّوس ہو جائے۔

اس حالت میں اگر کمزوریوں اور خامیوں کی نشان دہی اس غرض کے لیے ہو کہ انہیں رفع کرنے اور معیارِ کمال کی طرف بڑھنے کے لیے مزید جدوجہد کی جائے تو اس سے زیادہ مبارک کام کوئی نہیں۔ انسانی کاموں میں جو اصلاح وترقی بھی ممکن ہے‘ اسی طریقے سے ممکن ہے اور اس سے غفلت تباہ کن ہے۔ لیکن اگر انفرادی کمزوریاں اور اجتماعی خامیاں اس لیے تلاش کی جائیں کہ انہیں کام نہ کرنے اور بددل ہو کر بیٹھ جانے کے لیے بہانہ بنانا ہو تو یہ خالص شیطانی وسوسہ اور نفس امارہ کا مکر ہے...... اور اس بہانے کا سدباب اس وقت تک نہیں ہو سکتا جب تک فرشتوں کی کوئی ٹولی انسانی جماعتوں کی جگہ لینے کے لیے نہ آ جائے۔ اس بہانے کو پیش کرنا کسی ایسے شخص کو زیب نہیں دیتا جو خود کمزوریوں اور خامیوں سے اپنی ذاتِ اَقدس کے پاک ہونے کا ثبوت مہیا نہ کر دے۔ اس طرح کی باتوں کا حاصل کبھی یہ نہیں ہوتا کہ کوئی کمزوری دُور ہو یا کوئی خامی رفع ہو جائے‘ بلکہ یہ کمزوریوں اور خامیوں کو بڑھانے کا مجرب نسخہ ہے۔

اس کا حاصل یہ ہوتا ہے کہ ایک شخص یہ راہ اختیار کر کے اپنے گردوپیش کے دوسرے تمام ضعیف الارادہ لوگوں کے لیے ایک غلط مثال بن جاتا ہے۔ وہ ان سب کو یہ راہ دکھا دیتا ہے کہ اپنے ضعف کا اعتراف کر کے نکو بننے سے بچیں‘ اور خود اپنے نفس کو بھی فریب دے کر مطمئن کریں۔ اس کی پیروی میں ہر بےعمل آدمی بددلی کا ڈھونگ رچانے لگتا ہے اور اس بددلی کو حق بجانب ثابت کرنے کے لیے ساتھیوں کی کمزوریاں اور جماعت کی خامیاں ڈھونڈ ڈھونڈ کر ایک

فہرست تیار کرنی شروع کر دیتا ہے۔ پھر اس سے بدی کا ایک چکر چل نکلتا ہے۔ ایک طرف جماعت میں عیب چینی وخردہ گیری اور الزام وجوابِ الزام کی ایک وبا پھوٹ پڑتی ہے جو اس کے اخلاقی مزاج کا ستیاناس کر دیتی ہے۔ دوسری طرف اچھے خاصے سرگرم اور مخلص آدمی جو کسی ضعفِ ارادہ میں مبتلا نہ تھے‘ کمزوریوں اور خامیوں کے اس چرچے سے متاثر ہو کر بددلی کا شکار ہو جاتے ہیں۔ جب اس مرض کی روک تھام کے لیے کچھ کیا جاتا ہے تو بددلوں کا ایک بلاک بننے لگتا ہے‘ بددلی ایک مسلک اور تحریک کی شکل اختیار کرتی ہے۔ بددل ہونا‘ بددل کرنا اور بددلی کے حق میں دلائل فراہم کرنا‘ بجائے خود ایک کام بن جاتا ہے‘ اور جو لوگ اصل مقصد کے لیے کام کرنے میں سُست ہو چکے تھے وہ اس کام میں خوب چستی دکھانے لگتے ہیں۔ یوں اُن کی مری ہوئی دلچسپی زندہ تو ہوتی ہے مگر اس شان کے ساتھ کہ اس کا زندہ ہونا درحقیقت اس کی موت سے زیادہ افسوس ناک ہوتا ہے۔

یہ ایک خطرہ ہے جس سے ہر اُس جماعت کو باخبر رہنا چاہیے جو اصلاح وتعمیر کی سعی کے لیے اٹھے۔ اس کے کارکنوں اور کارفرماؤں کو ضعفِ ارادہ کے نقصانات اور اس کی بسیط ومرکب صورتوں کے فرق اور ان میں سے ہر ایک کے اثرات ونتائج سے اچھی طرح واقف ہونا چاہیے اور اس کے ابتدائی آثار نمودار ہوتے ہی اصلاح کی فکر کرنی چاہیے۔

ضعفِ ارادہ بسیط یہ ہے کہ جماعت میں کوئی شخص اس کام کو برحق اور اس کا بیڑا اٹھانے والی جماعت کو صحیح مانتے ہوئے عملاً سُستی اور دلچسپی میں کمی دکھانی شروع کر دے۔ اس صورت کے رونما ہوتے ہی چند تدبیریں اختیار کرنی چاہئیں۔

ایک یہ کہ ایسے شخص کے حالات کی تحقیق کر کے یہ معلوم کیا جائے کہ اس کی سُستی کی وجہ آیا ضعفِ ارادہ ہی ہے‘ یا کچھ حقیقی مشکلات ہیں جو اسے سُست کر رہی ہیں۔ اگر حقیقی مشکلات پائی جائیں تو جماعت کو ان سے باخبر ہونا چاہیے تاکہ انہیں رفع کرنے میں ایک رفیق کی مدد بھی کی جائے اور اس کی سُستی دوسروں کی نگاہ میں کوئی معنی بھی نہ پہن سکے‘ نہ کسی کے لیے غلط نظیر بن سکے۔ اور اگر اصل سبب ضعفِ ارادہ ہی متحقق ہو تو بھونڈے طریقوں سے اجتناب کرتے ہوئے‘ حکمت کے ساتھ ایسے شخص کے معاملے کو جماعت کے سامنے ان لوگوں کے معاملے سے ممیز ہو جانا چاہیے جو حقیقی مشکلات کی وجہ سے کام میں سرگرم نہ ہوں۔

دوسرے یہ کہ ضعیف الارادہ آدمی کی حالت جس وقت بھی نوٹس میں آئے اس کے ضعف کو تذکیر و تلقین اور نصیحت کے ذریعے سے دور کرنے کی کوشش شروع کر دینی چاہیے۔ خصوصیت کے ساتھ جماعت کے بہتر آدمیوں کو اُس کی طرف توجہ کرنی چاہیے کہ اُس کے مرتے ہوئے جذبے کو اکسائیں اور عملاً اسے اپنے ساتھ لگا کر حرکت میں لانے کی سعی کریں۔

تیسرے یہ کہ ایسے شخص کو ٹوکتے رہنا چاہیے' تاکہ جماعت میں اس طرح کی سُستی اور بے عملی ایک معمولی چیز نہ بن جائے اور دوسرے لوگ ایک دوسرے کا سہارا لے کر بیٹھتے نہ چلے جائیں۔ جماعت کے اندر وقتاً فوقتاً اگر اس امر کا محاسبہ ہوتا رہے کہ کون وقت' محنت اور مال کا کتنا ایثار کر سکتا ہے اور کتنا کر رہا ہے اور کس کی کارگزاری اس کی واقعی استعداد سے کیا نسبت رکھتی ہے' تو پھر یہ اس شخص کے لیے کسی نہ کسی حد تک خجالت کا موجب ہو گا جو محاسبہ کی میزان میں ہلکا اتر رہا ہو اور یہ خجالت لوگوں کو سُست پڑنے سے روکتی رہے گی۔ لیکن یہ محاسبہ اس انداز سے نہ ہونا چاہیے کہ بسیط ضعفِ ارادہ کا مریض مرکب ضعفِ ارادہ میں مبتلا ہو جائے۔ حکمت کا تقاضا یہ ہے کہ ایک شخص میں جو کمزوری پیدا ہو رہی ہے اسے اگر رفع نہ کیا جا سکے تو کم از کم بڑھنے بھی نہ دیا جائے۔ نادانی کے ساتھ ضرورت سے زیادہ جوش دکھانے کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ایک برائی میں پڑا ہوا آدمی اس سے شدید تر برائی کی طرف زبردستی دھکیل دیا جاتا ہے۔

ضعفِ ارادہ مرکب یہ ہے کہ آدمی اپنی کمزوری پر جھوٹ اور مکر کے پردے ڈالنے کی کوشش کرے' اور بڑھتے بڑھتے یہ ثابت کرنے پر اتر آئے کہ خرابی اس میں نہیں ہے بلکہ جماعت میں ہے۔ یہ محض ایک کمزوری نہیں ہے' بلکہ ایک بداخلاقی ہے جسے کسی ایسی جماعت میں پھلنے پھولنے نہ دینا چاہیے جو اخلاقی بنیادوں ہی پر دنیا کی اصلاح کرنا چاہتی ہو۔

اس کا پہلا درجہ یہ ہے کہ آدمی کام نہ کرنے کے لیے جھوٹے عذرات اور بے بنیاد بہانے پیش کرے۔ اس چیز سے چشم پوشی کرنا خود اس شخص سے بھی بے وفائی ہے جس میں یہ اخلاقی عیب اُبھرتا نظر آ رہا ہو اور اس جماعت سے بھی بے وفائی ہے جس کے ساتھ بہت سے لوگوں نے ایک مقصدِ عظیم کی خاطر جان و مال کی بازی لگائی ہو۔ ایسی جماعت میں شریک ہونے والے ہر شخص کے اندر کم از کم اتنی اخلاقی جرأت اور ضمیر کی زندگی ہونی چاہیے کہ اگر اپنے جذبے کی کمزوری کے باعث وہ کام نہ کرے تو صاف صاف اپنی کمزوری کا اعتراف کر لے۔ اعترافِ

قصور کے ساتھ ایک شخص کا عمر بھر اس کمزوری میں مبتلا رہنا اس سے بدرجہا بہتر ہے کہ وہ ایک مرتبہ بھی اس کو چھپانے کے لیے جھوٹے بہانوں سے مدد لے۔ یہ عیب جب بھی ظاہر ہو اس پر سرزنش ہونی چاہیے' کبھی اس کی ہمت افزائی نہ کی جانی چاہیے۔ علیحدگی میں سرزنش کرنے پر وہ اس طریقے سے باز نہ آئے تو علانیہ جماعت میں اُسے ملامت کی جائے اور ان عذرات کی حقیقت کھول دی جائے جنہیں وہ اپنے لیے حُجت بنا رہا ہو۔ اس میں تساہل برتنے کے معنی یہ ہیں کہ جماعت کے اندر ان خرابیوں کا دروازہ کھول دیا جائے جن کی تفصیل ہم اوپر بیان کر آئے ہیں۔

اس کا دوسرا درجہ یہ ہے کہ ایک کوتاہ عمل اور سُست کار آدمی اپنی اس حالت کے لیے جماعت کے افراد کی کمزوریوں اور جماعت کے کام اور نظام کی خامیوں کو ذمہ دار ٹھہرائے اور انہیں اپنی بددلی کا سبب قرار دے۔ یہ درحقیقت خطرے کی سرخ جھنڈی ہے جو اس بات کا پتا دیتی ہے کہ اب یہ شخص فتنہ پردازی کی طرف مائل ہو رہا ہے۔ اس موقع پر اس سے بددلی کے اسباب کی تفصیل پوچھنا غلط ہے۔ یہ سوال اس سے کرنے کے معنی یہ ہیں کہ اسے اس فتنے کے راستے پر چلا دیا جائے جس کے سرے پر ابھی وہ پہنچا ہی ہے۔ یہاں اسے عیب چینی کا اذنِ عام دینے کے بجائے اس کے دوستوں کو اسے خدا سے ڈرانا چاہیے اور اس کو شرم دلانی چاہیے کہ خود ایک ناقص کارنامہ اور خام کردار لے کر وہ کس منہ سے دوسروں پر تنقید کی جسارت کر رہا ہے۔ محنت کرنے والے' خدمت میں سرگرمی دکھانے والے' وقت اور مال کا ایثار کرنے والے اگر تیری کوتاہ عملی کو اپنے لیے بددلی کا موجب ٹھہرائیں تو حق بجانب ہوں گے' مگر تو کہاں بددلی کا روپ دھارنے چلا ہے' جبکہ بددل کرنے والی خرابیوں کو پیدا کرنے میں تیرا اپنا حصہ دوسروں سے بڑھ کر رہا ہے اور کام خراب کرنے میں تیرا اپنا عمل دوسروں کے لیے نظیر بن رہا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ اپنی تمام کمزوریاں اور خامیاں جماعت کے علم میں ضرور آنی چاہئیں اور جماعت کو بھی ان کے جاننے سے کترانا اور ان کی اصلاح کی سعی سے منہ نہ موڑنا چاہیے' لیکن انہیں بیان کرنا جماعت کے ان سرگرم خادموں کا کام ہے جو سب سے بڑھ کر خدمت میں جان لڑانے والے ہوں۔ وہی اس کا حق رکھتے ہیں اور وہی ایمان داری کے ساتھ صحیح تنقید بھی کر سکتے ہیں۔ کسی اخلاقی تحریک میں اس بے حیائی کی ہمت افزائی نہ کی جانی چاہیے کہ کام چور لوگ جو خدمت میں سُست اور کردار میں خام ہوں' وہ لمبی زبان لے کر جماعت کی خامیاں اور کمزوریاں

بیان کرنے لگیں۔ ایسی تحریک میں ان کا صحیح مقام شرمندگی وندامت اور اعترافِ قصور کا ہے‘ ناقد اور مصلح کا نہیں ہے۔ اس مقام پر اگر وہ خود آ کر کھڑے ہوں تو یہ سخت اخلاقی بیماری کی علامت ہے اور اگر جماعت میں ان کے لیے یہ مقام تسلیم کیا جائے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ جماعت پر اخلاقی دیوالیہ پن مسلط ہو رہا ہے۔

اس سلسلے میں یہ اصولی بات ذہن نشین رہنی چاہیے کہ ایک محرک اور متحرک جماعت کے لیے اس کے تندرست اعضاء کے احساسات کچھ اور معنیٰ رکھتے ہیں اور بیمار اعضاء کے احساسات کچھ اور معنیٰ۔ اس کے تندرست اعضاء وہ ہیں جو اپنے کام کی دھن میں لگے ہوئے ہوں‘ اپنا تن من دھن سب کچھ انہوں نے اس کام میں لگا دیا ہو اور جن کا نامۂ اعمال یہ بتا رہا ہو کہ وہ اپنی حدِ استطاعت تک خدمت میں کوئی کوتاہی نہیں کر رہے ہیں۔ بیمار اعضاء وہ ہیں جنہوں نے کبھی اپنی حدِ وسع کے مطابق خدمت کا حق ادا نہ کیا ہو‘ یا جو کچھ عرصہ تک سرگرم رہنے کے بعد ٹھنڈے پڑ چکے ہوں اور جن کا نامۂ اعمال ان کی کوتاہیوں کا صریح ثبوت دے رہا ہو۔ ان دونوں کے احساسات میں وہی فرق ہے جو تندرست آنکھ اور بیمار آنکھ کی بینائی میں ہوتا ہے۔

جماعت اپنی کمزوریوں اور خامیوں کا اگر صحیح اندازہ کر سکتی ہے تو صرف اپنے تندرست اعضاء ہی کے احساسات کے واسطے سے کر سکتی ہے۔ وہ اعضاء جو کام نہ کر رہے ہوں اور کام چھوڑنے کے لیے اپنی بددلی کا خود اظہار کر رہے ہوں‘ کبھی اس کا قابلِ اعتماد واسطہ نہیں بن سکتے۔ ان کے احساسات اگر سو فیصد نہیں تو اسّی‘ نوے فیصد گمراہ کن ہوں گے‘ اور جو جماعت خودکشی نہ کرنا چاہتی ہو‘ وہ ہرگز ان کے دیے ہوئے احساسات پر اپنے نتائج کی بنا نہیں رکھ سکتی۔

یہ خیال کرنا کہ خامیاں اور کمزوریاں جو بھی سامنے لا کر رکھ دے‘ بس گڑگڑا کر ہمیں اُن کے آگے توبہ واستغفار شروع کر دینی چاہیے اور پھر انہی پر اپنے اندازوں کی بنا رکھ کر یہ فیصلہ بھی کر ڈالنا چاہیے کہ ہم کیا کچھ کرنے کے قابل ہیں اور کیا کچھ کرنے کے قابل نہیں ہیں‘ نیکی ہو تو ہو مگر عقل مندوں کی نہیں‘ سادہ لوح اور مغفّل لوگوں کی نیکی ہے۔ دنیا میں اس طرح کے نیک لوگوں نے نہ پہلے کچھ بنایا ہے اور نہ اب کچھ بنا سکتے ہیں۔ اپنے کمال کے زعم میں مبتلا ہو جانا جتنی بڑی نادانی ہے‘ اس سے کچھ کم نادانی یہ نہیں ہے کہ اپنے نقائص اور اپنی قوتِ کار کا اندازہ ہر کس و ناکس کے بیان پر کر ڈالا جائے اور یہ نہ دیکھا جائے کہ بیان کرنے والا کس حد تک صحیح صورتحال سمجھنے اور بیان کرنے کا اہل ہے۔

ایک اور بات جو اس مقام پر خوب سمجھ لینے کی ہے‘ وہ یہ ہے کہ ایک مقصد کے لیے کام کرنے والی جماعت کو اپنے سامنے اخلاق اور صلاحیتِ کار کے دو معیار رکھنے ہوتے ہیں۔ ایک معیارِ مطلوب‘ یعنی وہ انتہائی بلند معیار جس تک پہنچنے کی مسلسل جدّوجُہد جاری رہنی چاہیے۔ دوسرا کم سے کم قابلِ عمل ہونے کا معیار (minimum workable) جس کو لے کر کام چلایا جاسکتا ہو اور جس سے نیچے گر جانا قابلِ برداشت نہ ہو۔ ان دونوں قسم کے معیاروں کے معاملے میں مختلف ذہن کے لوگ مختلف طرزِ عمل اختیار کرتے ہیں۔

ایک ذہن اصل مقصد کے لیے کام کرنے کو چنداں اہمیت نہیں دیتا۔ کام بنے یا بگڑے یا بالکل ختم ہو جائے‘ یہ اُس کے لیے کوئی زندگی اور موت کا مسئلہ نہیں ہوتا۔ وہ اس کام کو چھوڑ کر بھی مزے سے جی سکتا ہے اور کام میں شریک رہ کر بھی اس طرح شرکت کر سکتا ہے کہ اس کے وقت‘ مال اور قوتوں کو جونک نہ لگنے پائے۔ یہ ذہن بسا اوقات فکر ونظر کی عیاشی کے طور پر اور کبھی اپنے فرار کے لیے پُرفریب معذرت کے طور پر اخلاق کے آسمانوں پر اُڑتا ہے اور معیارِ مطلوب سے کم پر کسی طرح مطمئن نہیں ہوتا۔ اس سے کم جو کچھ بھی نظر آتا ہے اس پر وہ بڑی بے چینی اور بددلی کا اظہار کرتا ہے۔ مگر یہ بے چینی کام کے لیے نہیں بلکہ کام سے فرار کے لیے ہوتی ہے‘ خواہ یہ فراری ذہنیت شعوری ہو یا غیر شعوری۔

دوسرا ذہن اگرچہ مقصد اور اس کے لیے کام کرنے کو بڑی اہمیت بلکہ پوری اہمیت دیتا ہے‘ مگر تخیل پرستی میں مبتلا ہونے کی وجہ سے معیارِ مطلوب اور کم سے کم قابلِ عمل ہونے کے معیار کا فرق ٹھیک ٹھیک ملحوظ نہیں رکھتا۔ یہ خود بھی بار بار الجھن میں پڑتا ہے اور پہلی قسم کے ذہن کی چھوت بڑی آسانی سے اس کو لگ جاتی ہے۔ اس طرح وہ اپنے آپ کو بھی پریشان کرتا ہے اور کام کرنے والوں کے لیے بھی اچھی خاصی پریشانیوں کا موجب بن جاتا ہے۔

تیسرا ذہن وہ ہوتا ہے جسے مقصد کے لیے کام کرنا اور کام چلانا ہوتا ہے اور جسے اس کام کے بناؤ اور بگاڑ کی پوری ذمہ داری اپنے اوپر ہونے کا احساس ہوتا ہے۔ اسے اس کا مقام خود ہی اس بات پر مجبور کرتا ہے کہ ہر وقت دونوں قسم کے معیاروں کا ٹھیک ٹھیک فرق ملحوظ رکھتے ہوئے کام کرے اور یہ دیکھتا رہے کہ مقصد کی طرف پیش قدمی کی رفتار کسی معقول اور وزنی سبب کے بغیر متاثر نہ ہونے پائے۔

(باقی صفحہ 103 پر)

فریضۂ اقامتِ دین اور رفیقِ تنظیم

عبدالرؤف ☆

تنظیم اسلامی کے قیام کا مقصد غلبہ و اقامتِ دین کی جدّوجُہد کرنا ہے۔ اسی لیے جب اس کا تعارف کرایا جاتا ہے تو یہ لکھا جاتا ہے کہ ’’تنظیم اسلامی مروّجہ مفہوم کے اعتبار سے نہ کوئی سیاسی جماعت ہے نہ مذہبی فرقہ‘ بلکہ ایک اصولی اسلامی انقلابی جماعت ہے‘ جو اوّلاً پاکستان اور بالآخر ساری دنیا میں دینِ حق یعنی اسلام کو غالب کرنے یا بالفاظِ دیگر نظامِ خلافت کو قائم کرنے کے لیے کوشاں ہے!‘‘ اسی طرح تنظیم اسلامی کی اساسی دعوت جسے قبول کر کے کوئی فرد تنظیم میں شامل ہوتا ہے‘ اُس کے تین نکات ہیں۔ سب سے پہلے تجدیدِ ایمان یعنی اپنے ایمان کو از سرِنو تازہ کرنا۔ اس بات کا اقرار کرنا کہ اللہ کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں ہے اور حضرت محمد ﷺ اُس کے بندے اور رسول ہیں۔ اس کے بعد توبہ کرتے ہوئے یہ اقرار کرنا کہ میں اللہ تعالیٰ سے اپنے تمام سابقہ گناہوں کی بخشش طلب کرتا ہوں اور اُس کی جناب میں توبہ کرتا ہوں۔ آخر میں تجدیدِ عہد کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ سے یہ وعدہ کرنا کہ اُس کی راہ میں مقدور بھر جہاد کروں گا۔ ہر وہ چیز جو اُسے ناپسند ہے‘ چھوڑ دوں گا اور اللہ تعالیٰ کے دین کی اقامت اور اُس کے کلمہ کی سربلندی کے لیے اپنا مال بھی خرچ کروں گا اور جان بھی کھپاؤں گا۔ اس کے بعد وہ بیعت سمع وطاعت کے یہ الفاظ دہراتا ہے کہ اس مقصد کے لیے میں امیر تنظیم اسلامی کے ہاتھ پر بیعت کرتا ہوں کہ معروف کے دائرے میں اُن کا ہر حکم سنوں گا اور مانوں گا‘ چاہے مجھ پر تنگی ہو یا آسانی‘ چاہے دل چاہ رہا ہو یا نہ چاہ رہا ہو‘ اور چاہے مجھ پر کسی کو ترجیح کیوں نہ دی جائے‘ اور صاحبِ امر کے ساتھ کوئی جھگڑا نہیں کروں گا‘ البتہ جہاں کہیں بھی ہوں گا حق بات ضرور کہوں گا اور اس معاملے میں کسی ملامت گر کی ملامت سے نہیں ڈروں گا۔

☆ معاون شعبہ تعلیم و تربیت‘ تنظیم اسلامی

جو شخص بھی تنظیم میں شامل ہوتا ہے‘ درج بالا الفاظ کو دہراتا ہے۔ اس کے بعد آہستہ آہستہ اُسے دین کی طرف سے عائد ہونے والی ذمہ داریوں کے متعلق بتایا جاتا ہے جن کی ادائیگی کے نتیجہ میں اُس کے دینی فکر میں پختگی اور عمل میں بعض پہلوؤں سے بہتری آنے لگتی ہے۔

بعض رفقاء آغاز میں صحیح طریقہ سے آگے نہیں بڑھ پاتے‘ جبکہ اس کے برعکس بعض آغاز میں تو تنظیم کے تقاضوں کو پوری دلی آمادگی اور محنت کے ساتھ پورا کرنے کی کوشش کرتے ہیں لیکن کچھ عرصہ کے بعد ان کے جذبہ میں کمی محسوس کی جانے لگتی ہے۔ یہ بات سامنے آتی ہے کہ جس جذبہ کے ساتھ انہوں نے آغاز کیا تھا‘ اب اس میں کافی سُستی آتی جا رہی ہے اور توجہ دلانے کے باوجود اُن پر کوئی خاطر خواہ اثر نہیں ہو پا رہا۔ اسی طرح کچھ رفقاء تنظیمی و تربیتی اجتماعات میں تو کافی فعال ہوتے ہیں لیکن انفرادی دعوت کی ادائیگی میں معیارِ مطلوب تک نہیں پہنچ پاتے۔ رفقاء کی ایک تعداد ایسی بھی ہے جو تنظیمی اور دعوتی امور میں تو اتنے فعال نہیں ہوتے لیکن فقہی ابحاث اور سیاسی تجزیہ کرنے میں زیادہ دلچسپی لیتے ہیں اور اس طرح کسی نہ کسی فقہی مسلک یا سیاسی جماعت کے حق میں یا مخالفت میں بہت آگے چلے جاتے ہیں۔

رفقاء کی درج بالا اقسام بیان کرنے کا مقصد اس امر پر غور کرنا ہے کہ ایک خالص اصولی اسلامی انقلابی جماعت کے رفقاء ان مسائل سے کیوں دوچار ہوتے ہیں جس کے نتیجہ میں وہ جماعت کے اصل مقصد سے دور ہو جاتے ہیں! اس کا اثر جہاں اُن کی اپنی شخصیت پر پڑتا ہے وہیں جماعت بھی اُس سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ پاتی اور اس کی رفتار تیز ہونے کے بجائے سُست ہو جاتی ہے۔ لہٰذا جائزہ لینے کی ضرورت ہے کہ ایسا کیوں ہو رہا ہے! ویسے تو اس کی بہت سی وجوہات بیان کی جا سکتی ہیں‘ مثلاً معاشی حالات کی ناسازگاری‘ تنظیمی تقاضوں کی اہمیت سے ناواقفیت‘ دعوت دینے کے طریقہ سے نابلد ہونا‘ مسلکی فرقہ واریت کی یلغار یا سیاسی تشدد اور عدم برداشت کا رویہ۔ اسی طرح کے اور بہت سے محرکات بھی ہو سکتے ہیں جن کی وجہ سے تنظیم اسلامی کے رفقاء میں یہ کمزوریاں پیدا ہوتی ہیں۔ ان تمام وجوہات کے علی الرغم ہمارے خیال میں سب سے بڑی وجہ ایک ہی ہے‘ اور وہ ہے موجودہ حالات میں فریضۂ اقامتِ دین کی فرضیت اور اہمیت کو نہ سمجھ پانا۔ لہٰذا ایک رفیق تنظیم کے لیے یہ شعور رکھنا انتہائی ضروری ہے کہ موجودہ ظالمانہ اور طاغوتی نظام کے تحت زندگی گزارنا اور اس سے بھرپور فائدہ اٹھاتے ہوئے زیادہ سے زیادہ

سہولیات حاصل کرنا کتنا بڑا گناہ اور جرمِ عظیم ہے۔اس وقت کا سب سے بڑا منکر یہی نظامِ باطل ہے اور اسی منکرِ اعظم کو ختم کر کے اس کی جگہ معروفِ اعظم یعنی اسلامی نظام کا قیام اُمّت کا اہم ترین فریضہ ہے۔لہٰذا جب تک ہم اسے زندگی اور موت کا مسئلہ سمجھ کر اس کے لیے بھر پور جِدّوجُہد نہیں کریں گے اُس وقت تک نہ ہی دُنیوی اعتبار سے کامیاب ہو سکتے ہیں اور نہ ہی اخروی اعتبار سے‘ کیونکہ ہماری آخرت دنیا میں غلبۂ دین کی جدّوجُہد کے ساتھ جڑی ہوئی ہے۔اسی کے متعلق اللہ تعالیٰ نے سورۃ الصف میں واضح انداز میں فرمایا کہ:

﴿یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا هَلْ اَدُلُّكُمْ عَلٰى تِجَارَةٍ تُنْجِیْكُمْ مِّنْ عَذَابٍ اَلِیْمٍ ۝۱۰ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَتُجَاهِدُوْنَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ بِاَمْوَالِكُمْ وَاَنْفُسِكُمْ ؕ ذٰلِكُمْ خَیْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ۝۱۱﴾

’’اے ایمان کے دعوے دارو! کیا مَیں تمہیں ایسی تجارت کے بارے میں بتاؤں جو تمہیں دردناک عذاب سے چھٹکارا دلا دے؟ (وہ یہ کہ) تم ایمان لاؤ اللہ اور اُس کے رسول (ﷺ) پر اور جہاد کرو اللہ کے راستے میں اپنے مالوں اور اپنی جانوں کے ساتھ۔یہ تمہارے لیے بہتر ہے اگر تم سمجھ رکھتے ہو۔‘‘

لہٰذا آخرت میں دردناک عذاب سے بچنے کا یہی طریقہ ہے کہ دنیا میں اللہ ربّ العزت کے دین کے غلبہ کے لیے جان و مال سے بھر پور جہاد کیا جائے۔اگلی آیت میں دنیا میں غلبہ کی خوشخبری بھی ان الفاظ میں دے دی گئی ہے کہ:

﴿وَاُخْرٰى تُحِبُّوْنَهَا ؕ نَصْرٌ مِّنَ اللّٰهِ وَفَتْحٌ قَرِیْبٌ ؕ وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِیْنَ ۝۱۳﴾

’’اور ایک اور چیز جو تمہیں بہت پسند ہے۔اللہ کی طرف سے مدد اور قریبی فتح۔اور (اے نبی ﷺ!) آپ مؤمنین کو خوشخبری سنا دیجیے۔‘‘

دین کے محدود اور جامد تصور کے تحت ایک رفیقِ تنظیم کے ذہن میں بھی نماز‘ روزہ‘ حج اور زکوٰۃ یا کچھ دیگر مراسمِ عبودیت کی اہمیت فریضۂ اقامتِ دین کے مقابلے میں زیادہ رہتی ہے۔اُسے اپنی نماز یا دیگر عبادات کی فکر تو بہت رہتی ہے لیکن دعوت و اقامتِ دین کی اہمیت اُس تناسب سے اُس پر واضح نہیں ہو پاتی۔اکثر و بیشتر رفقاء اسے ایک اضافی نیکی سمجھ کر ہی کر رہے ہوتے ہیں۔اس لیے توجّہ کا ارتکاز اس فریضہ پر اس درجے نہیں ہو پاتا۔ایسے تمام رفقاء سے یہی گزارش ہے کہ فقہی اور قانونی حوالے سے تو ان عبادات کی اہمیت پوری طرح مسلّم ہے لیکن

اقامتِ دین کی جِدّوجُہد کرنے والے ایک رفیق کے لیے تعلق مع اللہ کو قائم رکھنے کے لیے نہ صرف فرض عبادات بلکہ نفل عبادات سے بھی گہرا شغف ہونا ضروری ہے۔یہ تقرب الی اللہ کا بہترین ذریعہ بھی ہیں۔البتہ فریضہ اقامتِ دین کی جِدّوجُہد کا تعلق حقیقی ایمان سے ہے۔سورۃ الحجرات میں حقیقی ایمان کے جن دو نتائج یا اجزاء کا ذکر آیا ہے وہ دل میں یقین اور عمل میں جہاد ہیں۔ان دونوں اجزاء کو جب ایمان کے پانچ ارکان کے ساتھ جوڑا جاتا ہے تو یہ کل سات اجزاء بن جاتے ہیں۔ایمان چونکہ خاص ہے جبکہ اسلام عام ہے اور اسلام ایمان کے اندر شامل ہے‘ لہٰذا نتیجتاً ایمان کے سات اجزاء یا ارکان بن جاتے ہیں۔ان کی ترتیب اس طرح ہے:

(i) یقین قلبی (ii) شہادتِ زبانی (iii) نماز
(iv) روزہ (v) حج (vi) زکوٰۃ
(vii) جہاد فی سبیل اللہ

یہ ترتیب اگر کسی رفیق پر واضح ہو جائے تو اس کی تنظیمی اور دعوتی سرگرمیوں میں لازمی اضافہ ہوتا چلا جائے گا۔مزید برآں ایک رفیقِ تنظیم اگر نبی اکرم ﷺ کے اس فرمان کا فہم حاصل کر لے تو اُس پر فریضہ اقامتِ دین کی اہمیت مزید مبرہن ہو جائے گی۔وہ فرمانِ نبویؐ یہ ہے کہ ’’اسلام کی ابتدا حالتِ غربت میں ہوئی تھی اور عنقریب ایسے ہی غریب (اجنبی) ہو جائے گا جیسے آغاز میں تھا۔پس خوشخبری ہے غرباء کے لیے (یعنی وہ لوگ جو حالتِ غربت میں اسلام کے ساتھ اپنا تعلق جوڑے رکھیں گے)۔‘‘ دوسری حدیث میں ان اجنبیوں کے متعلق سوال کیا گیا کہ: یارسول اللہ ﷺ! وہ اجنبی کون لوگ ہوں گے؟ تو آپ ﷺ نے ان کی جو تعریف بیان کی وہ مختلف روایات میں ان الفاظ میں بیان ہوئی ہے:

(i) اپنے قبیلوں سے الگ ہو جانے والے۔
(ii) جو میرے بعد میری سُنّت میں لوگوں کے پیدا کردہ بگاڑ کی اصلاح کریں گے۔
(iii) جو میری سُنّت کو زندہ کریں گے اور لوگوں کو اس کی تعلیم دیں گے۔
(iv) جو لوگوں میں فساد پھیل جانے پر بھی نیکی پر قائم رہیں گے۔
(v) برے لوگوں کی کثیر تعداد کے مقابلے میں یہ قلیل العدد ہوں گے۔ان کی بات ماننے والے تھوڑے اور نہ ماننے والے کثیر تعداد میں ہوں گے۔

حدیث مبارکہ میں اسلام کی غربت کے دور میں اس کے ساتھ تعلق جوڑے رکھنے والوں کی جو پانچ خصوصیات بیان ہوئی ہیں ان کی روشنی میں ہر رفیق کو اپنا جائزہ لینا ہوگا۔ جس طرح چودہ سو سال قبل اسلام مغلوب تھا‘ آج بھی اپنی اجتماعی حیثیت میں مسلمانوں کی کثیر تعداد کے باوجود مغلوب ہے۔ اجتماعی نظام کے تین بڑے گوشوں سیاست‘ معیشت اور معاشرت پر غیر اللہ کا تسلط اور حاکمیت قائم ہے۔ بہت تھوڑے لوگ ہیں جنہیں اس کا شعور حاصل ہے کہ غیر اللہ کی حاکمیت پر مبنی ظالمانہ اور طاغوتی نظام کو ختم کر کے اللہ سبحانہ وتعالیٰ کا عطا کردہ عادلانہ نظام زندگی نافذ کرنا ہماری ذمہ داری ہے۔ تنظیم اسلامی اور اس کے رفقاء بھی ان میں شامل ہیں۔ تو کیا حدیث نبویؐ میں بیان کی گئی غرباء کی خصوصیات کی روشنی میں ہم:

(۱) مروّجہ منافقانہ سیاست اور مذہبی فرقہ واریت سے الگ ہو کر اپنا تشخص قائم رکھنے کے ساتھ ساتھ معاشرے میں موجود غلط عقائد‘ بدعات اور غیر اسلامی رسومات سے اپنا دامن بچا کر اپنے قبیلہ اور برادری سے الگ ہو رہے ہیں یا نہیں؟

(۲) نبی اکرم ﷺ کی اہم ترین سُنّت یعنی غلبۂ دین کی جدوجہد کے حوالے سے عوام میں پیدا ہونے والے بگاڑ اور دین کے محدود بلکہ مسخ شدہ تصور کی اصلاح کر پا رہے ہیں؟

(۳) دعوت واقامتِ دین والی سُنّت کو صحیح معنوں میں زندہ کر کے لوگوں کو اس کی تعلیم دے رہے ہیں؟

(۴) لوگوں میں فساد (جسے قرآن حکیم میں فتنہ کہا گیا ہے‘ اور غیر اللہ کی حاکمیت پر مبنی ہر نظام فتنہ ہے) کے خلاف کھڑے ہونے کے ساتھ ساتھ نیکی کے اصل قرآنی تصور پر قائم رہنے کی کوشش کر رہے ہیں؟

(۵) برے لوگوں کی ایک بڑی جمعیت کے مقابلے میں واقعی ایسا مضبوط گروہ بننے کی کوشش کر رہے ہیں جس کے متعلق اللہ تعالیٰ نے واضح فرمادیا کہ:

﴿كَمْ مِّنْ فِئَةٍ قَلِيْلَةٍ غَلَبَتْ فِئَةً كَثِيْرَةًۢ بِاِذْنِ اللّٰهِ ؕ وَاللّٰهُ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ ۝۲۴۹﴾ (البقرة)

’’کتنی ہی مرتبہ ایسا ہوا ہے کہ ایک چھوٹی جماعت بڑی جماعت پر غالب آ گئی اللہ کے حکم سے۔ اور اللہ تو صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔‘‘

اگر درج بالا تمام خصوصیات ایک رفیق کے اندر پیدا ہونا شروع ہو جائیں تو تنظیم اسلامی کے ساتھ اس کا ایک انتہائی گہرا قلبی و ذہنی رشتہ قائم ہو جائے گا۔ اس کے قدم ہر آنے والے دن کے ساتھ آگے بڑھتے چلے جائیں گے‘ یہاں تک کہ تنظیم کے اندر اس کی حیثیت مشین کے اُس پرزے کی طرح ہو جائے گی جس کی حرکت سے اس کے دوسرے تمام پرزے رواں دواں ہو جاتے ہیں۔ دینِ حق کے غلبے کا وقت قریب آتا ہوا محسوس ہوگا جس کے نتیجہ میں وہ رفیق:

(i) تنظیم کے تمام اجتماعات میں وقت کی پابندی کے ساتھ حاضر ہوگا۔

(ii) تمام تربیتی اہداف کی جلد از جلد تکمیل کی کوشش کرے گا۔

(iii) تنظیم کے تمام مجوزہ لٹریچر کا مطالعہ باقاعدگی کے ساتھ کرے گا۔

(iv) فرض ونفل نمازوں‘ تلاوتِ قرآن اور ترجمہ وتشریح قرآن کے مطالعہ میں باقاعدگی اختیار کرے گا۔

(v) اپنی ذات‘ اہل وعیال‘ والدین اور بہن بھائیوں کی آخرت کی بھی فکر کرے گا۔

(vi) دین کی دعوت کو اس کی اصل روح کے ساتھ پھیلانے کے لیے تن من دھن لگائے گا۔

(vii) امیر تنظیم کی طرف سے جب نظامِ باطل کے خلاف نکلنے کی آخری پکار آ جائے تو اُس پر لبیک کہتے ہوئے اپنی جان ہتھیلی پر رکھ کر میدان میں نکل آئے گا۔

اس کے نتیجہ میں بالآخر کفر کی تمام قوتیں شکست کھا جائیں گی اور اللہ کا دین ان شاء اللہ غالب ہو کر رہے گا جس کے لیے اللہ کا وعدہ ہے کہ: ﴿جَآءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ ؕ اِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوْقًا ۝۸۱﴾ (بنی اسرائیل)

❁❁❁

جہاد فی سبیل اللہ
اصل حقیقت‘ اہمیت ولزوم اور مراحل ومدارج
بانی تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد رحمۃ اللہ علیہ کا ایک جامع خطاب

تصوّرِ اقامتِ دین

چند اعتراضات کا جائزہ

سیّد سعادت اللہ حسینی

مسلمان اہلِ علم کا ایک طبقہ اسلام کی جامعیت اور اجتماعی زندگی سے متعلق اس کی تعلیمات کو تسلیم کرتا ہے۔ یہ لوگ مانتے ہیں کہ اسلام نے ریاست کا تصور بھی دیا ہے‘ ریاست کے لیے قوانین بھی تجویز کیے ہیں‘ اور یہ احکام‘ اسلام اور اسلامی شریعت کا جزو ہیں۔ لیکن ساتھ ہی وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ: ’’ان احکام کا تعلق عام مسلمانوں سے نہیں ہے۔ اس کے مخاطب حکمران ہیں۔ اگر کسی کو حکومت اور اختیار مل جائے تو اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ قانون سازی اور ریاست کے انتظام وانصرام میں اللہ تعالیٰ کے احکام کی تعمیل کرے‘ لیکن عام مسلمان جنہیں حکومت یا اقتدار حاصل نہیں ہے‘ وہ نہ ان احکام کے مخاطب ہیں اور نہ وہ اس کے مکلف ہیں کہ اسلامی شریعت کی تعلیم‘ ترویج اور تنفیذ کے لیے کوئی اجتماعی جدّوجُہد کریں۔ ان کا فریضہ بس ذاتی زندگی میں اور معاشرے کے جن امور پر انہیں اختیار حاصل ہے‘ انہی میں اللہ کے احکام کی تعمیل تک محدود ہے۔‘‘

اقامتِ دین کے تصورات پر بعض مسلم دانش وروں کی جانب سے کی جانے والی تنقید دو طرح کی ہے۔ ایک تو وہ لوگ ہیں جو سرے سے اس بات کے قائل ہی نہیں ہیں کہ مملکت کے سیاسی اُمور اور اجتماعی معاملات میں اسلام بھی کوئی رہنمائی کرتا ہے‘ یا اگر کرتا بھی ہے تو آج کے زمانے میں اس کی پیروی لازم نہیں ہے۔ عصرِ حاضر کے سیکولر افکار سے متاثر یہ طبقہ سمجھتا ہے کہ: ’’اسلام سمیت تمام مذاہب کا دائرہ‘ افراد کی ذاتی زندگی تک محدود ہے۔ اجتماعی معاملات میں مذہب کی دخل اندازی فتنہ وفساد کا سبب بنتی ہے اور یہ مذہب کا دائرہ کار بھی نہیں ہے۔ اسلام کے وہ احکام جن کا تعلق ریاست کے انتظام اور پالیسی سے یا قانون سازی سے ہے‘ وہ ایک مخصوص دور کی ضرورتوں کے لیے تھے۔ آج اُن تعلیمات سے روشنی تو حاصل کی جاسکتی ہے لیکن اُن کی

ہو بہو پیروی نہ تو ممکن ہے اور نہ اس کی ضرورت ہے۔‘‘

اس تحریر میں ہم اس اعتراض کو زیرِ بحث نہیں لائیں گے کہ یہ اعتراض علیحدہ سے تفصیلی تجزیہ چاہتا ہے۔ اس مکتبِ فکر کا ذکر ابتدا ہی میں اس لیے کر دیا ہے کہ آگے کے مباحث میں اس کا حوالہ آئے گا۔ یہاں پر اقامتِ دین کے حوالے سے مولانا وحید الدین خان صاحب اور جناب جاوید احمد غامدی کے نقطۂ نظر کا خلاصہ پیش کر کے مسئلے کو سمجھنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔

Implementation of Islamic Law in Modern Times

The call for implementation of the sharî'a is as old as Islam itself, and is not a whim of the 1970s and 1980s. The implementation of sharî'a does not exist. This review essay shows that there are many possible views between the extreme position of full unconditional implementation of the sharî'a and complete rejection of it.

The views of the three Muslim Arab authors discussed in this essay are interesting for a number of reasons. They are the vanguard of Muslim"moderates" that dare to speak out in the vicious battle between opponents and proponents of implementation of sharî'a law. Their maxim is: Yes, the sharî'a should be applied, but on certain conditions. All three agree that implementation should take place not by revolution, but by an evolutionary process through legislation. Their main concern is that an Islamic society benefits from this implementation. It therefore, should take place in a new adopted form. The authors also agree that the necessary changes in a society cannot come about by legislation alone, but need to come from within the society.

The conditions by which sharî'a law should be implemented is also an issue of contention between the authors. Ashmâwî argues that sharî'a law is in effect already implemented in Egypt, since Egyptian law in most cases does not contradict sharî'a law. Jâbrî and Bishrî argue that sharî'a law still needs to be

implemented, and both advocate the reopening of the doors of ijtihâd. But where Jâbrî advocates a liberal interpretation of sharî‘a rules based on the common interest of the community, Bishrî takes the conservative view that sharî’a rules are not to be altered.

Link: 1:http//:www.al-mawrid.org

Link-2:http//:journals.openedition.org/ema/1542

Link-3:http//:www.cssforum.com.pk/css-compulsory-subjects/islamiat 4193-implementation-islamic-law-modern-times.html

اقامتِ دین کا تصوّر

اس نقطۂ نظر کا جائزہ لینے سے پہلے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اختصار کے ساتھ اقامتِ دین کے بارے میں تحریک اسلامی اور مولانا مودودیؒ کے خیالات کا خلاصہ پیش کر دیا جائے۔

جماعت اسلامی ہند کے دستور کی دفعہ ۴ میں جماعت کا نصب العین اس طرح بیان کیا گیا ہے: ’’جماعت اسلامی ہند کا نصب العین اقامتِ دین ہے‘ جس کا حقیقی محرک صرف رضائے الٰہی اور فلاح آخرت کا حصول ہے۔‘‘

’’اس نصب العین کی تشریح اسی دفعہ میں اس طرح کی گئی ہے:

’’اقامتِ دین میں لفظ ’’دین‘‘ سے مراد وہ دینِ حق ہے جسے اللہ رب العالمین اپنے تمام انبیاء ﷺ کے ذریعے مختلف زمانوں اور مختلف ملکوں میں بھیجتا رہا ہے اور جسے آخری اور مکمل صورت میں تمام انسانوں کے لیے اپنے آخری نبی حضرت محمد ﷺ کے ذریعے نازل فرمایا‘ اور جو اَب دنیا میں ایک ہی مستند‘ محفوظ اور عنداللہ مقبول دین ہے اور جس کا نام ’’اسلام‘‘ ہے۔ یہ دین انسان کے ظاہر و باطن اور اُس کی زندگی کے تمام انفرادی و اجتماعی گوشوں کو محیط ہے۔ عقائد‘ عبادات اور اخلاق سے لے کر معیشت‘ معاشرت اور سیاست تک انسانی زندگی کا کوئی ایک شعبہ بھی ایسا نہیں ہے جو اس دائرے سے خارج ہو۔ یہ دین جس طرح رضائے الٰہی اور فلاحِ آخرت کا ضامن ہے اسی طرح دنیوی مسائل کے موزوں حل کے لیے بہترین نظامِ زندگی بھی ہے‘ اور انفرادی و اجتماعی زندگی کی صالح اور ترقی پذیر تعمیر صرف اسی کے قیام سے ممکن ہے۔ اس دین کی اقامت کا مطلب یہ ہے کہ کسی تفریق و تقسیم کے بغیر اس پورے دین کی مخلصانہ پیروی کی جائے اور ہر طرف سے یکسو ہو کر کی جائے۔ اور انسانی زندگی کے انفرادی و اجتماعی تمام گوشوں میں

اسے اس طرح جاری و نافذ کیا جائے کہ فرد کا اِرتقا‘ معاشرے کی تعمیر اور ریاست کی تشکیل سب کچھ اسی دین کے مطابق ہو۔‘‘(۱)

دستورِ جماعت کی دفعہ ۵ اس نصب العین کے حصول کے لیے اختیار کیے جانے والے طریق کار سے بحث کرتی ہے۔ اس کے درج ذیل جملے قابلِ توجہ ہیں:

’’جماعت اپنے تمام کاموں میں اخلاقی حدود کی پابند ہو گی اور کبھی ایسے ذرائع یا طریقے استعمال نہ کرے گی جو صداقت و دیانت کے خلاف ہوں یا جن سے فرقہ وارانہ منافرت‘ طبقاتی کش مکش اور فساد فی الارض رُونما ہو۔ جماعت اپنے نصب العین کے حصول کے لیے تعمیری اور پُرامن طریقے اختیار کرے گی۔ یعنی وہ تبلیغ و تلقین اور اشاعتِ افکار کے ذریعے ذہنوں اور سیرتوں کی اصلاح کرے گی اور اس طرح ملک کی اجتماعی زندگی میں مطلوبہ صالح انقلاب لانے کے لیے رائے عامہ کی تربیت کرے گی۔‘‘(۲)

ان دفعات میں درج ذیل باتیں قابلِ غور ہیں:

۱۔ اقامتِ دین کا مطلب صرف ریاست کی سطح پر اسلامی احکام کا نفاذ نہیں ہے بلکہ پوری زندگی میں اسلام کی پیروی ہے۔ اس میں ریاست بھی شامل ہے اور اس کے ساتھ افراد کا اللہ سے تعلق‘ ان کے جذبات و داعیات‘ ان کی عبادات‘ ان کے اخلاق اور معاشرے سے متعلق تمام اُمور و معاملات بھی شامل ہیں۔

۲۔ دین کا قیام یا زندگی کے تمام گوشوں میں اسے جاری و نافذ کرنے کا کام زور زبردستی کے ذریعے انجام نہیں پائے گا‘ بلکہ لوگوں کی ذہن سازی یا رائے عامہ کی تربیت کے ذریعے انجام پائے گا۔

یہ باتیں اجتماعی کمٹ منٹ اور گہرے احساسِ ذمہ داری کے ساتھ جماعت کے دستور سے بھی واضح ہیں اور ساتھ ہی مولانا مودودیؒ کے افکار میں بھی بڑی وضاحت کے ساتھ ان باتوں کا اعادہ ملتا ہے۔ مولانا مودودیؒ کی تحریروں میں درج ذیل قسم کی باتیں کثرت سے ملتی ہیں:

☆ حکومت کا نظام اجتماعی زندگی میں بڑی گہری جڑیں رکھتا ہے۔ جب تک اجتماعی زندگی میں تغیر واقع نہ ہو‘ کسی مصنوعی تدبیر سے نظامِ حکومت میں کوئی مستقل تغیر پیدا نہیں کیا جا سکتا۔ عمر بن عبدالعزیز [م: ۷۲۰ء] جیسا فرماں روا جس کی پشت پر تابعین و تبع تابعین کی ایک بڑی جماعت بھی تھی‘ اس معاملے میں قطعی ناکام ہو چکا ہے‘ کیوں کہ

سوسائٹی بحیثیت مجموعی اس اصلاح کے لیے تیار نہ تھی۔ ہندوستان میں سلطان محمد بن تغلق [م: ۱۳۵۱ء] اور اورنگ زیب عالم گیر [م: ۱۷۰۷ء] جیسے طاقت ور بادشاہ اپنی شخصی دین داری کے باوجود نظامِ حکومت میں کوئی تغیر نہ کر سکے۔ یہ اس وقت کا حال ہے جب ایک شخص کی طاقت بہت کچھ کر سکتی تھی۔ اسلامی انقلاب بھی صرف اسی صورت میں برپا ہو سکتا ہے جب کہ ایک عمومی تحریک قرآنی نظریات وتصورات اور محمدی سیرت وکردار کی بنیاد پر اٹھے اور اجتماعی زندگی کی ساری ذہنی‘ اخلاقی‘ نفسیاتی اور تہذیبی بنیادوں کو طاقت اور جدوجہد سے بدل ڈالے۔(۳)

☆ میرا مشورہ ہمیشہ یہی رہا ہے کہ خواہ آپ کو بھوکا رہنا پڑے‘ گولیاں کھانی پڑیں‘ مگر صبر کے ساتھ‘ تحمل کے ساتھ‘ کھلم کھلا علانیہ طور پر اپنی اصلاحی تحریک کو قانون‘ ضابطے اور اخلاق حدود کے اندر چلاتے رہیے۔(۴)

☆ کوئی دوسرا نظام‘ مثلاً کمیونزم لوگوں پر زبردستی ٹھونسا جا سکتا ہے...... لیکن اسلام اس قسم کا نظام نہیں ہے۔ وہ پہلے لوگوں کے دلوں میں ایمان پیدا کرنا ضروری سمجھتا ہے‘ کیونکہ ایمان کے بغیر لوگ خلوص کے ساتھ اس کے بتائے ہوئے راستوں پر نہیں چل سکتے۔ پھر وہ اپنے اصولوں کا فہم اور ان کے برحق ہونے پر اطمینان بھی عوام کے اندر ضروری حد تک اور خواص (خصوصاً کارفرماؤں) میں کافی حد تک پیدا کرنا لازم سمجھتا ہے‘ کیوں کہ اس کے بغیر اس کے اصول واحکام کی صحیح تنفیذ ممکن نہیں ہے۔ اس کے ساتھ وہ عوام وخواص کی ذہنیت‘ اندازِ فکر اور سیرت وکردار میں بھی اپنے مزاج کے مطابق تبدیلی لانے کا تقاضا کرتا ہے‘ کیوں کہ یہ نہ ہوں تو اس کے پاکیزہ اور بلند پایہ اصول واحکام اپنی صحیح روح کے ساتھ نافذ نہیں ہو سکتے۔ یہ جتنی چیزیں میں نے بیان کی ہیں‘ اسلامی نظام کو برپا کرنے کے لیے سب کی سب ضروری ہیں اور ان میں سے کوئی چیز بھی جبراً لوگوں کے دل ودماغ میں نہیں ٹھونسی جا سکتی۔(۵)

☆ اسلامی تحریک کے کارکنوں کو میری نصیحت یہ ہے کہ انہیں خفیہ تحریکیں چلانے اور اسلحے کے ذریعے سے انقلاب برپا کرنے کی کوشش نہ کرنی چاہیے۔ یہ بھی دراصل بے صبری اور جلد بازی ہی کی ایک صورت ہے۔ ایک صحیح انقلاب ہمیشہ عوامی تحریک ہی کے ذریعے

سے برپا ہوتا ہے۔ کھلے بندوں عام دعوت پھیلایئے۔ بڑے پیمانے پر اذہان اور افکار کی اصلاح کیجیے۔ لوگوں کے خیالات بدلیے۔ اخلاق سے دلوں کو مسخر کیجیے اور اس کوشش میں جو خطرات اور مصائب بھی پیش آئیں اُن کا مردانہ وار مقابلہ کیجیے۔ اس طرح بتدریج جو انقلاب برپا ہو گا وہ ایسا پائیدار اور مستحکم ہو گا جسے مخالف طاقتوں کے ہوائی طوفان محو نہ کر سکیں گے۔ جلد بازی سے کام لے کر مصنوعی طریقوں سے اگر کوئی انقلاب رُونما بھی ہو جائے تو جس راستے سے وہ آئے گا‘ اُسی راستے سے وہ مٹایا بھی جا سکے گا۔(۶)

یہ اقتباسات ہم نے اس لیے نقل کیے ہیں تاکہ بحث کو آگے بڑھانے سے پہلے یہ واضح رہے کہ تحریک اسلامی اور مولانا مودودیؒ کے نزدیک اقامت دین کا مطلب اور اس منزل تک پہنچنے کا راستہ کیا ہے! اقامت دین صرف حکومت کی تشکیل یا تبدیلی کا نام نہیں ہے۔ یہ افراد اور معاشرے کی ہمہ گیر اصلاح کا کام ہے۔ ریاست کی تشکیل کا ہدف بھی یقیناً اس میں شامل ہے‘ لیکن صرف اسی تک محدود نہیں ہے اور نہ یہ اقامتِ دین کا اصل مقصد ہے۔ اقامتِ دین کا جو تصور ان عبارتوں سے واضح ہوتا ہے‘ وہ یہ ہے کہ اسلام کی دعوت لوگوں کے سامنے پیش کی جائے گی۔ لوگ اس کے قائل ہوں گے اور ان کے ذہن‘ اخلاق اور رویے اس دین سے ہم آہنگ ہوں گے تو اس کے نتیجے میں مثالی اسلامی معاشرے کے قیام کے لیے راہ ہموار ہوگی اور رائے عامہ کی تربیت کے نتیجے میں ریاست بھی اسلامی رنگ اختیار کرے گی۔ اقامتِ دین کا ہدف جب بھی حاصل ہو گا‘ دعوتِ دین اور پُرامن طریقے سے رائے عامہ کی تربیت ہی کا نتیجہ ہو گا۔

’’تعبیر کی غلطی‘‘ کے اعتراضات

مولانا وحید الدین خان صاحبؒ نے اس تصورِ اقامتِ دین پر جو اعتراضات کیے ہیں‘ ان کا خلاصہ درج ذیل ہے:(۷)

(۱) سورۃ شوریٰ کی آیت میں دین کا مطلب اس کا وہ حصہ ہے جو تمام انبیاءِ کرام علیہم السلام کی دعوت میں مشترک ہے۔ یہ حصہ صرف توحید‘ رسالت اور آخرت‘ یعنی اسلام کے بنیادی عقائد تک محدود ہے۔ اسی کے قیام کا‘ یعنی اس کی پیروی اور اس کی دعوت کا یہاں حکم دیا گیا ہے۔(۸)

(۲) سورۃ صف کی آیت میں (اسی مضمون کی آیت سورۃ توبہ میں اور اس سے مماثل آیت سورۃ فتح میں بھی آئی ہے) کوئی حکم یا ہدایت نہیں ہے بلکہ صرف خبر ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ اپنے

دین کو اپنے نبی کے ذریعے غالب کرے گا' یہ اللہ کے ارادے کا اظہار ہے۔ اس میں مومنین کے لیے کوئی حکم نہیں ہے۔ (۹)

(۳) دین کا مقصد بندے اور اللہ کے درمیان تعلق کو مضبوط کرنا ہے۔ یہی ایک مسلمان کا نصب العین ہے۔ ایک مسلمان کو دین پر عمل کرنا چاہیے اور دین کی دعوت پیش کرنی چاہیے۔ حکومت کی تبدیلی کے لیے جدوجہد اس کا کام نہیں ہے۔

مولانا وحید الدین خان صاحب یہ تو تسلیم کرتے ہیں کہ دین کا تعلق زندگی کے تمام معاملات سے ہے لیکن ان کا اصرار یہ ہے کہ سورۃ شوریٰ کی اس آیت میں' جس میں دین کو قائم کرنے کا حکم دیا گیا ہے' دین کا مطلب صرف ایمانیات ہے اور یہی معنی مفسرین نے لیے ہیں۔ ہمارے خیال میں یہ بات صحیح نہیں ہے۔ جن مفسرین نے ایمانیات اور بنیادی باتوں کا ذکر کیا ہے' انہوں نے اس کے ساتھ ''طاعة الله فى اوامره ونواهيه'' کو بھی دین کے مطلب میں شامل کیا ہے۔ اس میں دین کے تمام احکام آجاتے ہیں۔ مفسرین کے تفصیلی حوالوں کا یہ مضمون متحمل نہیں ہے۔ مولانا رضی الاسلام ندوی نے اقامتِ دین اور نفاذِ شریعت میں قتادہ' علامہ ابن العربی' زمخشری' قرطبی' خازن البغدادی' العمادی' آلوسی' بیضاوی' ابن کثیر' رازی وغیرہم کے اقتباسات نقل کیے ہیں(۱۰)' جن سے اس موقف کی تردید ہوتی ہے کہ مفسرین یہاں دین کے معنی کو صرف عقائد و ایمانیات تک محدود رکھتے ہیں۔ اس آیت میں الَّذِيْٓ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ (الرعد: ۳۰) کا فقرہ بھی شامل ہے جس میں خود بخود وہ سارے احکام آجاتے ہیں جو نبی کریم ﷺ پر نازل ہوئے۔ واقعہ یہ ہے کہ انبیاءِ کرام ؑ کی تعلیمات صرف عقائد اور ایمانیات ہی کے معاملے میں مشترک نہیں ہیں بلکہ ان کی دعوت کی روح بھی ایک ہی ہے۔ ان کی شریعتوں کی بنیادی باتیں بھی ایک ہی ہیں۔ اگر شرائع میں کچھ اختلاف ہے تو وہ جزوی اور فروعی باتوں میں ہے۔ اس آیت میں جو بات کہی گئی ہے اس کی وضاحت مولانا صدر الدین اصلاحی [۱۳ نومبر ۱۹۱۶ء۔۱۹۹۸ء] نے اس طرح کی ہے:

''ان حضرات (یعنی مفسرین کرام) کے نزدیک دین کی اصولی تعلیمات اور تمام انبیاءِ کرام ؑ کے لائے ہوئے دینوں کی مشترک و متفق علیہ ہدایاتِ الٰہی میں ایک اصولی تعلیم اور متفق علیہ ہدایت یہ بھی تھی کہ لوگوں کو اللہ تعالیٰ کے سارے اوامر کی بجا آوری

کرنی ہوگی اور اس کے تمام نواہی سے رکنا پڑے گا۔ اس جامع اصولی ہدایت کا عملی مفہوم کیا ہوگا اور اس کی عملی تعمیل کس شکل میں ہو سکے گی؟ یہ کوئی ایسا سوال نہیں جس کے جواب میں دو باتیں کہی جاسکیں۔ یہ جواب لازماً ایک ہی ہوگا اور وہ یہ کہ امت ان سارے احکام دین و شریعت کی مکمل پیروی کرے گی' جو اسے اس کے پیغمبر کے ذریعے دیے گئے ہوں۔ یعنی مسلمانوں کے لیے اس پوری شریعت کی پیروی اور اقامت اس آیت کی رُو سے واجب ہوگی جو حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کے ذریعے انہیں عطا ہوئی ہے۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ اس آیت میں دوسرے انبیاءِ کرام ؑ کے دینوں کا ذکر اسم موصول عام کے ذریعے کیا گیا ہے لیکن آں حضرت ﷺ کے دین کا ذکر اسم موصول خاص الَّذِيْٓ کے ذریعے کیا گیا ہے۔''(۱۱)

یہی بات اس آیت سے سمجھ میں آتی ہے اور یہی عام طور پر اس کی تفسیر بھی کی گئی ہے۔ یہاں دین کو اور قیامِ دین کے حکم کو صرف عقائد و ایمانیات تک محدود کر دینے کی کوئی وجہ نظر نہیں آتی۔ یہ کہنا کہ: ''مومن کا نصب العین رضائے الٰہی ہے اور قیامِ دین کی جدوجہد دین کا تقاضا تو ہو سکتا ہے' نصب العین نہیں ہو سکتا'' محض الفاظ اور طرزِ بیان کا فرق ہے۔ جماعت کے نصب العین کی جو عبارت ہم نے نقل کی ہے' اس میں رضائے الٰہی اور فلاحِ آخرت کے حصول کو ''حقیقی محرک'' کہا گیا ہے اور اس غرض کے لیے اجتماعی طور پر جس ہدف کی خاطر جدوجہد مطلوب ہے' اُسے نصب العین کہا گیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اصل محرک اور حتمی ہدف تو رضائے الٰہی ہی ہے لیکن اللہ کی رضا کا حصول ایک خاص قسم کی جدوجہد پر منحصر ہے۔ اس جدوجہد کا نشانہ اور ہدف اقامتِ دین ہی ہونا چاہیے۔ یہ بات بھی صرف دستورِ جماعت تک محدود نہیں ہے۔ مولانا مودودیؒ اور جماعت کے پورے لٹریچر میں اس کا بار بار اعادہ کیا گیا ہے۔ اب اگر آپ رضائے الٰہی کے حصول کو نصب العین قرار دیں اور اقامتِ دین کو اس کی ضرورت یا تقاضا کہیں تو الفاظ کی اس تبدیلی سے کوئی عملی فرق واقع نہیں ہوتا۔ اقامتِ دین اس صورت میں بھی ایک فریضے کے طور پر باقی رہتا ہے۔

مدیر ''اشراق'' کے اعتراضات

جناب جاوید احمد غامدی' مدیر ''اشراق'' (لاہور) نے اس تصور پر تفصیلی تنقید اپنے مضمون ''تاویل کی غلطی'' میں کی ہے' جو ان کی کتاب ''بُرہان'' میں شامل ہے۔ (۱۲) اس کے علاوہ

انہوں نے اپنی کئی ویڈیوز پر مبنی تقاریر میں بھی اس مسئلے پر اظہارِ خیال کیا ہے‘ اور اپنے دیگر مضامین اور تفسیر میں بھی اس سے متعلق اشارے فرمائے ہیں۔ ان کی باتوں کا خلاصہ یہ ہے:

۱۔ اقامت کا مطلب قائم کرنا یا نافذ کرنا نہیں ہے‘ بلکہ پیروی کرنا اور قائم رکھنا ہے۔ اس لیے سورۂ شوریٰ کی آیت میں صرف دین کی پیروی کا حکم ہے۔

۲۔ غلبۂ دین کا تعلق رسول اللہ ﷺ سے تھا۔ اللہ کی سُنّت ہے کہ جب رسول مبعوث ہوتا ہے تو دین غالب ہو کر رہتا ہے۔ یہ سُنّت‘ رسول اللہ ﷺ کے ذریعے پوری ہو گئی۔ اب عام مسلمان ان آیات کے مخاطب نہیں ہیں۔

۳۔ دین کے سیاسی اور اجتماعی احکام کے مخاطب حکمران ہیں اور وہی اس کے مکلف ہیں۔ عام مسلمانوں کا کام صرف اپنے دائرے میں دین پر عمل اور اس کی دعوت ہے۔

جاوید صاحب نے کلاسیکی عربی شاعری وغیرہ کے حوالوں سے تفصیلی بحث یہ ثابت کرنے کے لیے کی ہے کہ: ’’اَقِیۡمُوا کے معنی قائم کرنا نہیں ہے بلکہ قائم رکھنا ہے‘‘۔ ہمارا خیال یہ ہے کہ اقامت کا ترجمہ ’قائم کرنا‘ کیا جائے یا ’قائم رہنا‘ یا ’قائم رکھنا‘‘ اس سے اصل موضوع بحث پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ مولانا مودودیؒ نے ترجمہ ’قائم کرنا‘ کیا ہے لیکن تفہیم القرآن میں ’قائم رکھنا‘ کے ترجمے کی گنجائش کو بھی تسلیم کیا ہے۔ دین قائم کرنا یا دین پر قائم رہنا‘ دونوں کا مطلب یہی ہے کہ زندگی کے تمام شعبوں میں دین کی پیروی کی جائے۔ اس بات کو جاوید صاحب بھی تسلیم کرتے ہیں اور انہوں نے دین پر قائم رہنے کے معنوں میں قانون و شریعت اور جہاد و قتال وغیرہ سارے احکام شمار کیے ہیں‘ لیکن اس کے ساتھ ان کا کہنا یہ ہے کہ: ’’اَقِیۡمُوا کا مطلب دین کے صرف اُس حصے پر عمل تک محدود ہے جس کا تعلق ہماری ذات سے ہے‘ اور جن امور کا تعلق ہم سے نہیں ہے ان پر عمل کرانا یا انہیں نافذ کرنے کی جدّوجُہد کرنا اَقِیۡمُوا کے معنی میں شامل نہیں ہے‘‘۔ یہ نقطۂ نظر مفسرین کے بیان کیے ہوئے مطالب سے مختلف ہے۔

مولانا گوہر رحمٰن(۱۳) اور مولانا رضی الاسلام ندوی(۱۴) نے اپنی تحریروں میں اُن مفسرین کرام کے تفصیلی حوالوں سے بحث کی ہے جن کے نزدیک اَقِیۡمُوا کے معنوں میں دوسروں پر دین کا نفاذ بھی شامل ہے۔ یہاں اگر جاوید صاحب کی یہ بات مان بھی لی جائے کہ: اَقِیۡمُوا کے لغوی معنی صرف خود دین پر عمل کرنا ہے تو سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ خود دین کا کیا

مطلب ہے؟ کیا دین کے دائرے میں امر بالمعروف و نہی عن المنکر‘ دعوت‘ جہاد‘ اللہ کے دین کی نصرت‘ شہادت علی الناس وغیرہ جیسے اُمور نہیں آتے‘ جن کی قرآن میں تسلسل سے تاکید کی گئی ہے؟ جب یہ سب احکامِ دین ہیں اور دین کا جزو ہیں (اور جاوید صاحب بھی اسے تسلیم کرتے ہیں) تو اَقِیۡمُوا کے دونوں معنوں میں جو معنی بھی لیے جائیں اقامتِ دین کے اندر یہ سب کام خود بخود شامل ہو جاتے ہیں۔ یعنی اگر اَقِیۡمُوا کا مطلب صرف یہ ہے کہ دین کے جو مطالبات میری ذات سے متعلق ہیں‘ ان کی تکمیل کی جائے تب بھی دعوت‘ جہاد‘ نصرتِ دین وغیرہ کے احکام میری ذات سے متعلق ہی ہیں۔ ان کی تعمیل تو اقامتِ دین کا تقاضا ہی ہو گا۔

واقعہ یہ ہے کہ اقامتِ دین کا حکم کسی ایک آیت تک محدود نہیں ہے۔ قرآن کی پوری اسکیم میں اسے مرکزی ذمہ داری کی حیثیت حاصل ہے۔ قرآن نے اس کام کو کئی اصطلاحوں میں بیان کیا ہے۔ ’’اظہارِ دین‘‘، ’’قیامِ قسط‘‘، ’’قیامِ عدل‘‘، ’’شہادت علی الناس‘‘، ’’امر بالمعروف و نہی عن المنکر‘‘، ’’دعوتِ دین‘‘ —— ان سب میں اقامتِ دین کا مفہوم پوشیدہ ہے۔ ان سب احکام کا تقاضا یہی ہے کہ دین پر عمل کرنے کے ساتھ ساتھ باقی انسانیت کو دین کی طرف بلانے‘ دین پر انہیں مطمئن کرنے اور معاشرے میں اللہ تعالیٰ کے احکام کی ترویج و تنفیذ کی ممکنہ کوشش کی جائے۔ مولانا مودودیؒ اور اسلامی تحریکیں انہی باتوں کو اقامتِ دین قرار دیتی ہیں۔

جاوید صاحب قرآن کے بہت سے احکام کو نبی کریم ﷺ کے ساتھ مخصوص کر دیتے ہیں‘ حالاں کہ عام قاعدہ یہ ہے کہ قرآن میں اللہ تعالیٰ نے آنحضرت ﷺ کو مخاطب کر کے جو احکامات دیے ہیں وہ تمام مسلمانوں کے لیے ہیں‘ اِلّا یہ کہ نبی کریم ﷺ کے لیے ان کی تخصیص کی کوئی واضح دلیل ہو۔ اظہارِ دین والی آیات کے سلسلے میں بھی موصوف کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ اس میں نبی کریم ﷺ کے سلسلے میں اللہ کے وعدے اور سنت کا ذکر ہے۔ وہ یہاں المشرکون کا ترجمہ ’’عرب کے مشرک‘‘ اور الدین کله کا ترجمہ ’’عرب کے ادیان‘‘ کرتے ہیں۔ اس تخصیص کی بھی کوئی دلیل اس کے سوا نہیں دیتے کہ غلبۂ دین‘ رسول ﷺ کے سلسلے میں انبیاءؑ کی سُنّت ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے نبی مکرم ﷺ کے لیے دین کا غلبہ مکمل فرمایا۔ سورۂ صف کی اس آیت میں لِیُظۡهِرَه کے الفاظ دلالت کر رہے ہیں کہ یہاں اظہارِ دین کو نبی ﷺ کے مشن اور مقصد کے طور پر بیان کیا گیا ہے۔ یہاں صرف اللہ تعالیٰ کے ارادے کا

ہی اظہار نہیں ہے بلکہ نبی ﷺ کے مشن اور مقصد بعثت کا بھی اظہار ہے۔ صرف غلبۂ دین کے الٰہی ارادے کا اظہار مقصود ہوتا تو نبی ﷺ کی بعثت کے ذکر اور اس کے بعد اظہارِ دین کے ذکر کے ساتھ لام تعلیل (لِیُظھِرہٗ) کی ضرورت نہیں تھی۔ بے شک غلبۂ دین اللہ ہی کا منصوبہ ہے‘ لیکن اللہ تعالیٰ اپنے اس منصوبے کو نبی ﷺ کے ذریعے مکمل کرنا چاہتا تھا‘ اسی لیے اس نے نبی ﷺ کو مبعوث کیا۔ اسی وجہ سے اسے نبی ﷺ کا مشن کہا جاتا ہے۔ اگر یہ نبی ﷺ کا مشن اور اُن کا کام تھا تو نبی ﷺ کے بعد آپؐ کی اُمت کا کام کیوں نہیں ہوگا؟

جاوید صاحب غلبۂ دین کی سُنّتِ الٰہی کا تذکرہ اس طرح کرتے ہیں کہ کہیں کہیں یوں محسوس ہوتا ہے گویا اللہ تعالیٰ اس سُنّت کی تکمیل اپنے تکوینی امر کے ذریعے کرتا ہے۔ اسلامی تاریخ میں فرقہ جبریہ نے خدا کے تکوینی اور تشریعی احکام میں بڑا مغالطہ کیا تھا۔ زیر بحث فکر میں یہی مغالطہ غلبۂ دین کی سُنّت کے معاملے میں محسوس ہوتا ہے۔ امر واقعہ یہ ہے کہ ان آیات میں اِرسالِ رسول کا ذکر واضح طور پر اس بات کی دلیل ہے کہ اظہارِ دین کی سُنّتِ الٰہی نبی ﷺ کی جدوجہد کے ذریعے پوری ہوگی۔ نبی اللہ کی رہنمائی میں لیکن اپنے آزاد ارادے کے ساتھ اظہارِ دین کی جدوجہد کرتا ہے‘ فیصلے کرتا ہے‘ حکمتِ عملی بناتا ہے‘ جہاد کرتا ہے‘ معاہدے کرتا ہے‘ جہاں ضرورت ہو لڑتا ہے اور جہاں ضرورت ہو صلح کرتا ہے۔ دعوت‘ ہجرت اور جہاد کے مراحل سے گزرتا ہے۔ سیاسی حکمت عملی بناتا ہے اور اپنی تدبیروں سے‘ خدا کی مشیت کے تحت اس کی سنت کی تکمیل کرتا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے نبی مکرم ﷺ کے اسوہ کو تمام مسلمانوں کے لیے نمونہ قرار دیا ہے۔ آپؐ کا کام اب اس امت کو جاری رکھنا ہے۔ غلبۂ دین کے مشن کو نبی ﷺ کے ساتھ مخصوص کر دینے اور اُمت کو اس سے مستثنیٰ کر دینے کے لیے کوئی واضح دلیل موجود نہیں ہے‘ خصوصاً اس لیے کہ دیگر اور نصوص ایسے موجود ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ دین کا غلبہ بعد کے زمانوں میں بھی اللہ تعالیٰ کو مطلوب ہے۔ قرآن مجید میں کہا گیا ہے:

﴿وَلَا تَهِنُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَاَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ۝۱۳۹﴾ (آل عمران)

’’دل شکستہ نہ ہو‘ غم نہ کرو‘ تم ہی غالب رہو گے اگر تم مومن ہو۔‘‘

﴿وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ

كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ۠ وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِيْنَهُمُ الَّذِي ارْتَضٰى لَهُمْ وَلَيُبَدِّلَنَّهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ خَوْفِهِمْ اَمْنًا ۭ﴾ (النور:۵۵)

’’تم میں سے جو لوگ ایمان لائے اور اُنھوں نے اچھے عمل کیے ہیں‘ اُن سے اللہ کا وعدہ ہے کہ اُن کو وہ اِس سرزمین میں ضرور اُسی طرح اقتدار عطا فرمائے گا جس طرح اُن سے پہلے گزرے ہوئے لوگوں کو اُس نے عطا فرمایا تھا اور اُن کے لیے اُن کے دین کو پوری طرح قائم کر دے گا۔‘‘

حدیث میں ہے: ((اَلْاِسْلَامُ يَعْلُوْ وَلَا يُعْلٰى عَلَيْهِ))(۱۵) یعنی اسلام دنیا میں غالب ہونے کے لیے آیا ہے‘ سرنگوں ہونے کے لیے نہیں۔ امام مسلم نے اپنی صحیح میں ’’کتاب الامارۃ‘‘ کے تحت ایک پورا باب باندھا ہے‘ جس کا عنوان ہے: لَا تَزَالُ طَائِفَةٌ مِنْ اُمَّتِيْ ظَاهِرِيْنَ عَلَى الْحَقِّ لَا يَضُرُّهُمْ مَنْ خَالَفَهُمْ(۱۶) (میری امت کا ایک گروہ ہمیشہ حق پر قائم رہے گا اور اپنے مخالفوں پر غالب آئے گا۔) اسی طرح کا ایک باب امام بخاریؒ نے صحیح بخاری میں کتاب الاعتصام بالکتاب والسنة میں باندھا ہے۔ ان ابواب میں کئی حدیثیں بیان کی گئی ہیں‘ جن میں یہ کہا گیا ہے کہ اہل حق کا ایک گروہ اسلام کے لیے جدوجہد کرتا رہے گا اور اسے غلبہ ملے گا۔ مثلاً صحیح مسلم میں حضرت معاویہ ؓ سے مروی ایک حدیث بیان کی گئی ہے:

((مَنْ يُرِدِ اللّٰهُ بِهٖ خَيْرًا يُفَقِّهْهُ فِي الدِّيْنِ، وَلَا تَزَالُ عِصَابَةٌ مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ يُقَاتِلُوْنَ عَلَى الْحَقِّ ظَاهِرِيْنَ عَلٰى مَنْ نَاوَاهُمْ اِلٰى يَوْمِ الْقِيَامَةِ))(۱۷)

’’جس شخص کے ساتھ اللہ بھلائی چاہتا ہے اسے دین کی سمجھ دیتا ہے‘ اور ہمیشہ ایک جماعت مسلمانوں کی حق پر لڑتی رہے گی اور غالب آئے گی ان پر جو ان سے لڑیں قیامت تک۔‘‘

عقلی دلائل

اس مختصر مقالے میں تفصیلی شرعی دلائل کی گنجائش نہیں ہے۔ ضروری باتیں عرض کر دی گئی ہیں۔ جو لوگ تفصیل سے مطالعہ کرنا چاہیں وہ اس موضوع پر لکھی گئی بعض اہم کتابوں کو دیکھ سکتے ہیں۔ اب تک جن کتابوں کے حوالے آ چکے ہیں ان کے علاوہ‘ خصوصاً مولانا احمد عروج قادری کی کتاب ’’اقامتِ دین فرض ہے‘‘ اور ’’اُمتِ مُسلمہ کا نصب العین‘‘ نیز مولانا صدر الدین اصلاحی کی کتاب ’’فریضہ اقامتِ دین‘‘ اور مولانا سیّد جلال الدین عمری کی کتاب ’’معروف و

منکر‘ وغیرہ کا مطالعہ مفید ہوگا۔

اس موقع پر ہم اس موضوع کو عقل عام (common sense) کے پہلو سے بھی زیر بحث لاتے ہیں:

(۱) دونوں معترض حضرات یہ بات مانتے ہیں کہ اسلام نے اجتماعی امور سے متعلق تفصیلی ہدایات دی ہیں‘ اور ان ہدایات کی تعمیل آج کے دور میں بھی ضروری ہے اور یہی انسان کی فلاح اور کامیابی کا خدائی نسخہ ہے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کے لیے ایک اجتماعی نظام کو پسند کیا ہے‘ تو پھر آج بندوں کے درمیان اس کو متعارف کرانے اور اسے جاری کرنے کا کیا انتظام ہے؟ ایک زمانے میں نفاذ کا یہ کام اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول ﷺ سے لیا تھا۔ اب اگر آج عام مسلمان اس کے نفاذ کی جدوجہد کے مکلف نہیں ہیں تو پھر یہ کام کس کے ذمہ ہے؟

یہ بات تو عقل عام کے خلاف ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسانوں کے لیے ایک مکمل نظامِ زندگی نازل کیا‘ بڑی وضاحت کے ساتھ اس کی تفصیلات بتائیں‘ انہیں محفوظ رکھنے کا بھی انتظام کیا‘ ایک زمانے میں اپنے رسول ﷺ کے ذریعے اس کی تبلیغ واشاعت اور تنفیذ کا بھی انتظام کیا‘ لیکن بعد کے اَدوار میں انہیں انسانوں کے درمیان مقبول کرنے اور ان کے معاشروں میں جاری و ساری کرنے کا کوئی انتظام ہی نہیں کیا۔ یہ بات تو کم از کم آج کے دور میں کوئی معقول آدمی نہیں کہہ سکتا کہ کوئی اجتماعی نظامِ زندگی صرف اس کے تعارف اور پیش کش کے ذریعے خود بخود نافذ ہوسکتا ہے۔ اگر کوئی اس انتہائی سادہ لوح مفروضے پر یقین رکھتا ہے تو آج کا سارا علمِ سیاسیات اور علمِ سماجیات اس کی تردید وتغلیط کے لیے موجود ہے۔ ہر نظریہ اور نظام اپنے نفاذ کے لیے انسانی جدوجہد چاہتا ہے‘ اور ایسی کوشش چاہتا ہے جو اجتماعی ہو اور مطلوب نظامِ زندگی کو ہدف بنا کر کی جائے۔ اگر صرف نظریہ اور اصولوں کی موجودگی کافی ہوتی تو قرآن کا نزول کافی تھا‘ رسولؐ کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔

انفرادی زندگی سے متعلق اسلامی احکام بھی انسانوں کی فلاح کے لیے ہیں اور یہی معاملہ اجتماعی زندگی سے متعلق احکام کا بھی ہے۔ جس طرح شرک اور جھوٹ ایک فرد کے لیے نقصان دہ ہے‘ اسی طرح سود اور قوم پرستی اور انسانوں کی غیر مشروط خودمختاری انسانی معاشروں کے لیے نقصان دہ ہیں۔ اللہ تعالیٰ کو اگر اپنے بندوں کی فوز وفلاح مقصود ہے‘ اور صرف افراد کی نہیں بلکہ

معاشروں کی اجتماعی فلاح بھی مطلوب ہے‘ تو یہ ممکن نہیں ہے کہ وہ اپنے نازل کردہ ان اصولوں کی تنفیذ کا کوئی انتظام ہی نہ کرے جو انسانوں کے لیے نہایت ضروری ہیں (ہم یہاں اس بحث کو نہیں چھیڑ رہے ہیں کہ افراد کی اصلاح کا بھی ایک بڑا پہلو سماجی اور معاشرتی اصلاح سے ہے)۔ اللہ تعالیٰ اپنے دین کی ترویج وتنفیذ کا کام انسانوں ہی سے لیتا ہے۔ اسی لیے قرآنِ مجید میں اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں سے اپنے دین کی نصرت کرنے اور اللہ کا مددگار بننے کا حکم دیا ہے:

﴿یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اِنْ تَنْصُرُوا اللّٰهَ یَنْصُرْكُمْ وَ یُثَبِّتْ اَقْدَامَكُمْ ۝۷﴾ (محمد)

’’اے ایمان والو! اگر تم اللہ کی مدد کرو گے تو وہ تمہاری مدد کرے گا اور تمہارے قدم جما دے گا۔‘‘

﴿یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْۤا اَنْصَارَ اللّٰهِ﴾ (الصف:۱۴)

’’اے لوگو جو ایمان لائے ہو‘ اللہ کے مددگار بنو۔‘‘

اس کا مطلب اس کے سوا اور کیا ہوسکتا ہے کہ دین کے معاملے میں منشائے الٰہی کی تکمیل کے لیے جدوجہد کی جائے۔ اگر منشائے الٰہی یہ ہے کہ یہ دین زندگی کے تمام انفرادی واجتماعی معاملے میں انسانوں کا رہنما بنے‘ تو اس منشا کی تکمیل کے لیے جدوجہد ہی دین کی نصرت قرار پائے گی۔ اسی جدوجہد کو اسلامی تحریکیں ’’اقامتِ دین‘‘ کی جدوجہد کہتی ہیں۔

دنیا میں ہمیشہ ایسی قوتیں کارفرما رہی ہیں‘ جو انسانی زندگی کی تنظیم گمراہ کن شیطانی اصولوں اور نظریات کی بنیاد پر کرنے کی کوشش کرتی رہتی ہیں۔ کیا یہ بات اللہ تعالیٰ کی مشیت اور اس کی اسکیم کا حصہ ہوسکتی ہے کہ معاشرے میں قوم پرستانہ فسطائیت اور کمیونزم کی منظم تحریک جاری و ساری ہو‘ انتہا پسندانہ سرمایہ داری کے قیام ونفاذ کی منظم جدوجہد ہوتی رہے‘ نسائیت پرست اور ہم جنس پرست منظم ہوکر اپنے اپنے سیاسی ومعاشی تصورات کے نفاذ کے لیے سرگرم رہیں لیکن اللہ کا مکمل دین اور انسانی فوز وفلاح کا حقیقی ضامن نظریۂ حیات صرف کتابوں میں بند رہے‘ یا ایسے حکمران کے انتظار میں راہ تکتا رہے جو ان احکام کی تنفیذ کو اپنی ذمہ داری سمجھے؟ یہ بات عقلِ عام کے بالکل خلاف ہے۔ اگر اللہ تعالیٰ انسانوں کے لیے کسی مخصوص نظریۂ حیات کو پسند کرتا ہے تو اس کا تقاضا ہے کہ وہ اس کی تنفیذ کے لیے جدوجہد کی ذمہ داری کسی نہ کسی کے سپرد کرے۔ یہ فطری بات ہے کہ یہ ذمہ داری انہی کے سپرد کی جائے گی جو اس نظریے کے ماننے

والے اور اس کے امین ہیں۔

(۲) اگر اجتماعی امور میں احکامِ دین کے نفاذ کی ذمہ داری صرف حکمرانوں کی ہے' تب بھی کیا عام مسلمان امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے پابند نہیں ہیں؟ اگر حکمران اپنی ذمہ داریاں ادا نہیں کر رہے اور اللہ کے احکام سے علانیہ انحراف کر رہے ہیں' تو کیا یہ مسلمانوں کی ذمہ داری نہیں ہے کہ وہ اس کی طرف اپنے حکمرانوں کو متوجہ کریں؟

رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

((اَلدِّیْنُ النَّصِیْحَۃُ..... لِلّٰہِ وَ لِکِتَابِہٖ وَلِرَسُوْلِہٖ وَلِاَئِمَّۃِ الْمُسْلِمِیْنَ وَعَامَّتِھِمْ))(۱۸)

’’دین خیرخواہی کا نام ہے ...... خیرخواہی اللہ کے لیے' اُس کی کتاب کے لیے' اُس کے رسول کے لیے' مسلمانوں کے اماموں کے لیے اور عام مسلمانوں کے لیے۔‘‘

ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ مروان نے عید کے دن منبر نکلوایا اور نمازِ عید سے پہلے خطبہ شروع کر دیا' تو ایک شخص نے کہا: مروان! آپ نے سنت کے خلاف کیا۔ ایک تو آپ نے اس دن منبر نکالا حالاں کہ اس دن منبر نہیں نکالا جاتا۔ پھر آپ نے نماز سے پہلے خطبہ شروع کیا' حالاں کہ نماز سے پہلے خطبہ نہیں ہوتا۔ ابوسعید خدریؓ نے کہا: اس شخص نے تو اپنا وہ حق جو اس پر تھا ادا کر دیا۔ مَیں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے سنا ہے:

((مَنْ رَاٰی مِنْکُمْ مُنْکَرًا فَلْیُغَیِّرْہُ بِیَدِہٖ، فَاِنْ لَّمْ یَسْتَطِعْ فَبِلِسَانِہٖ، فَاِنْ لَّمْ یَسْتَطِعْ فَبِقَلْبِہٖ، وَذٰلِکَ اَضْعَفُ الْاِیْمَانِ))(۱۹)

’’تم میں سے جو شخص کوئی بات خلافِ شرع دیکھے' تو اگر اسے ہاتھ سے روکنے کی طاقت رکھتا ہو تو اسے ہاتھ سے روک دے' اگر اس کی طاقت نہ ہو تو اپنی زبان سے روکے' اور اگر اس کی بھی طاقت نہ ہو تو اس کو دل سے بُرا جانے' اور یہ ایمان کا سب سے کمزور درجہ ہے۔‘‘

ایک حدیث مبارکہ میں فرمایا گیا:

((سَتَکُوْنُ اُمَرَاءُ فَتَعْرِفُوْنَ وَتُنْکِرُوْنَ، فَمَنْ عَرَفَ بَرِیئَ وَمَنْ اَنْکَرَ سَلِمَ، وَلٰکِنْ مَنْ رَضِیَ وَتَابَعَ)) قَالُوْا: اَفَلَا نُقَاتِلُھُمْ؟ قَالَ: ((لَا، مَا صَلَّوْا))(۲۰)

’’عنقریب ایسے حکمران ہوں گے جنہیں تم پہچانتے ہو گے اور ان کا انکار کرو گے' پس جس

کسی نے ان (کی حقیقت) کو پہچان لیا وہ بری ہوگا' جس کسی نے برملا ان کا انکار کیا وہ تو سلامتی کے راستے پر ہوگا' سوائے اس کے جو اُن پر راضی ہوگیا اور ان کی اطاعت کرنے لگا (یعنی نہ وہ بری ہے اور نہ سلامتی کے راستے پر)‘‘۔ صحابہؓ نے عرض کیا: اے اللہ کے رسولؐ! کیا ایسے امراء کے خلاف ہمیں قتال نہیں کرنا چاہیے؟ آپؐ نے فرمایا: جب تک وہ نماز ادا کرتے رہیں (ایسا مت کرنا۔)‘‘

امام مسلم نے اپنی صحیح میں جہاں اس حدیث کا باب باندھا ہے' اس باب کا موضوع ہی رکھا ہے: باب وجوب الانکار علی الامراء فیما یخالف الشرع وترک قتالھم ما صلوا ونحو ذٰلک (یعنی اس بات کا باب کہ اگر امراء شریعت کی خلاف ورزی کریں تو ان کی نکیر واجب ہے......)۔ گویا جو حکمران اللہ کے احکام کی کھلی نافرمانی کریں' ان کے خلاف خروج اور قتال کے لیے تو کچھ اور شرائط ہیں' لیکن ان کی نکیر اور ان کو معروف کی تلقین اور اسلام کے نفاذ کے لیے ان کو آمادہ کرنا' یہ کام تو ہر حال میں اہلِ ایمان کو انجام دینا ہے۔

(۳) آج کے زمانے میں ملکوں کے نظام اور قوانین کے لیے صرف حکمران ہی نہیں بلکہ عوام بھی ذمہ دار ہوتے ہیں۔ دنیا کے بیش تر ملکوں میں تو جمہوری نظام ہے۔ اس نظام کی تو تعریف ہی یہی ہے کہ وہاں قانونی طور پر عوام ہی اصل حکمران ہوتے ہیں۔ حکومت کے کام انہی کے منتخب نمائندے انجام دیتے ہیں۔ ملک کی قانون سازی اور پالیسی سازی عوامی رجحانات کے مطابق ہی ہوتی ہے۔ اس لیے اب تو یہ بحث بالکل غیر متعلق ہے کہ حکمرانی سے متعلق احکامِ دین کے مخاطب صرف حکمران ہیں' عوام نہیں۔ اب یہ بات ساری دنیا میں مسلّمہ ہے کہ جمہوری حکومتوں میں جو پالیسیاں بھی بنتی ہیں' ان کے لیے عوام پوری طرح ذمہ دار ہیں۔ عوام کے سامنے جواب دہ اور عوام کے ووٹ سے منتخب حکومت' اگر اللہ کے احکام کی کھلی خلاف ورزی کرتی ہے اور ’’وَمَنْ لَّمْ یَحْکُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰہُ‘‘ کی تصویر بنی رہتی ہے' تو اس معاشرے میں رہنے والے مسلمان کیسے اس کی ذمہ داری سے بری ہو سکتے ہیں؟ براءت کی ایک ہی شکل ممکن ہے اور وہ یہ کہ وہ معاشرے کو اسلام کے نفاذ کے لیے تیار کرنے کی بساط بھر کوشش کرتے رہیں۔ بلاشبہ وہ کسی ایسے کام کے مکلّف نہیں ہیں جو اُن کی طاقت اور استعداد سے باہر ہو' لیکن جو کچھ ان کے بس میں ہے اُس جدوجہد کی ذمہ داری سے وہ کیسے بَری ہو سکتے ہیں؟ اسلام میں اجتماعی ذمہ داری کا

تصور بھی پایا جاتا ہے۔ ہم کو ایسے واضح نصوص بھی ملتے ہیں جن میں معاشرے کی اجتماعی خرابیوں کے لیے اس کے ہر فرد کو ذمہ دار قرار دیا گیا ہے:

﴿وَاتَّقُوْا فِتْنَةً لَّا تُصِيْبَنَّ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مِنْكُمْ خَآصَّةً ۚ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ﴿۲۵﴾﴾ (الانفال)

’’اور بچو اُس فتنے سے جس کی شامت مخصوص طور پر انہی لوگوں تک محدود نہ رہے گی جنہوں نے تم میں سے گناہ کیا ہو۔ اور جان رکھو کہ اللہ سخت سزا دینے والا ہے۔‘‘

جاوید صاحب خود اس آیت کی تشریح میں لکھتے ہیں:

’’دنیا میں خدا کا قانون یہی ہے کہ بعض اوقات ایک گروہ کے جرائم کی سزا پوری قوم کو بھگتنا پڑتی ہے۔ یہ اُس سے متنبہ فرمایا ہے کہ اپنے رویے کی اصلاح کرلو' ورنہ اندیشہ ہے کہ اُس طرح کے کسی فتنے میں مبتلا ہو جاؤ گے جو پوری جماعت بلکہ آئندہ نسلوں کو بھی اپنی لپیٹ میں لے لیا کرتا ہے۔ اللہ کے دین میں اسی بنا پر لوگوں کو پابند کیا گیا ہے کہ وہ دوسروں کو بھی بھلائی کی تلقین کریں اور برائی سے روکیں۔‘‘(۲۱)

حدیث میں آیا ہے:

((مَا مِنْ قَوْمٍ يُعْمَلُ فِيهِمْ بِالْمَعَاصِي فَلَمْ يُغَيِّرُوا إِلا أَوْشَكَ أَن يَعُمَّهُمُ اللّٰهُ بِعِقَابٍ))(۲۲)

’’اگر کسی قوم میں گناہ کے کام کیے جاتے ہوں اور ان کاموں کو روکنے کی کوئی کوشش نہ کی جائے تو قریب ہے کہ اللہ تعالیٰ ان سب کو عذاب میں گرفتار کر لے۔‘‘

(۴) کسی نظریے پر پختہ ایمان کا لازمی تقاضا یہ ہوتا ہے کہ اس کے نفاذ کے لیے جدوجُہد کی جائے کہ یہی انسانی فطرت ہے۔ اگر کوئی یہ سمجھتا ہے کہ اسلام کے اجتماعی احکام پر عمل ضروری نہیں ہے (اس مکتب فکر کا ہم نے ابتدا میں ذکر کیا تھا) تو اس کا معاملہ مختلف ہے۔ لیکن اگر کسی کا یہ ایمان ہے کہ اسلام سیاست سمیت زندگی کے ہر شعبے میں رہنمائی کرتا ہے' اور یہ رہنمائی ہی انسانوں کی فوز وفلاح کی واحد ضامن ہے' تو اس کے بعد اس نظریے کے نفاذ کا خواب دیکھنا اور اس کے لیے ممکنہ جدوجُہد کرنا خود بخود اس کی ذمہ داری بن جاتا ہے۔

زندگی کے مشن اور نصب العین کا گہرا تعلق اعتقاد (belief) سے ہوتا ہے۔ ہر مشن اور نصب العین کسی اعتقاد کی پیداوار ہوتا ہے اور ہر پختہ عقیدہ کسی نہ کسی نصب العین کو لازماً جنم دیتا

ہے۔ اعتقاد اور زندگی کے مشن کے درمیان یہ گہرا تعلق آج علم انتظامیات' سماجی نفسیات' سماجیات وغیرہ کا مسلّمہ اصول ہے۔ ان سب علوم میں یہ بحثیں موجود ہیں کہ آدمی اپنے بارے میں اور دیگر انسانوں اور کائنات کے بارے میں جو نقطۂ نظر یا اعتقاد رکھتا ہے اور جن قدروں (values) اور اصولوں کو اپنے لیے اور دیگر انسانوں کے لیے درست اور صحیح سمجھتا ہے' اسی نظامِ اقدار سے اس کی زندگی کا مشن تشکیل پاتا ہے۔ کسی بھی میدان میں تبدیلی کی ضرورت پر پختہ یقین آدمی کو اس تبدیلی کی تحریک چلانے پر مجبور کرتا ہے۔ اس لیے اقامتِ دین کا نصب العین اس عقیدے کا لازمی نتیجہ ہے کہ اسلام اللہ کا دین ہے اور اسی میں انسانوں کی نجات ہے۔ عقلی اعتبار سے یہ ممکن ہی نہیں ہے کہ آدمی کا عقیدہ تو اسلام میں ہو لیکن اسلام کا قیام اس کا نصب العین نہ بنے۔

اگر آج مَیں کینسر کی ایک نئی دوا ایجاد کرلوں اور میرے اندر یہ مستحکم یقین پیدا ہو جائے کہ اس دوا سے کینسر کا ہر مریض لازماً شفا پالے گا اور یہ کہ اس انمول دوا کی ترویج اس وقت عالمِ انسانیت کی ایک بڑی ضرورت ہے' تو اس عقیدے کا لازمی نتیجہ یہ نکلے گا کہ اس دوا کی ترویج اور ملک کے نظامِ صحت میں اس کی قبولیت میرا نصب العین بن جائے گا۔ اگر اس دوا کے کارگر ہونے پر کامل یقین کے باوجود میں اسے لے کر گھر میں بیٹھا رہوں تو میری یہ خاموشی انسانیت کے خلاف ہی تصور کی جائے گی اور میرے ضمیر بلکہ میری انسانی فطرت کے خلاف ہوگی۔ مختلف نظریات (isms) کے علَم بردار اپنے اپنے نظریات کے قیام ونفاذ کے لیے اس بات کے محتاج نہیں ہیں کہ ان کی کتابوں کی عبارتوں کی لغات کے ذریعے تشریح کر کے بتایا جائے کہ اس کا قیام ونفاذ تمہاری ذمہ داری ہے۔ ان اصولوں کی صحت پر یقین اور اُن کے انسانوں کے لیے مفید اور موزوں ہونے پر یقین بذاتِ خود اس بات کے لیے کافی تصور کیا جاتا ہے کہ وہ ان کے نفاذ کو اپنی زندگی کا نصب العین قرار دے دیں۔

یقیناً اسلام نے یہ اصول دیا ہے کہ نفاذ کا یہ کام زور زبردستی کے ساتھ نہیں ہوگا۔ مَیں کینسر کی دوا بھی کسی مریض کو بندوق کی نوک پر نہیں پلاؤں گا۔ ڈاکٹروں کو بھی اس کی اجازت نہیں ہوتی۔ میں دوسروں کا یہ حق بھی تسلیم کروں گا کہ اگر کوئی اس دوا کو مؤثر نہیں سمجھتا یا نقصان دہ سمجھتا ہے تو وہ بھی اپنی بات لوگوں کے سامنے پیش کرے' لیکن میں آخری کوشش اس مقصد کے لیے ضرور کروں گا کہ لوگ اس کی افادیت کے قائل ہو جائیں' اس کے حق میں رائے عامہ بن جائے

اوراس کی تنفیذ ممکن ہو جائے ۔ بالکل یہی کام مجھے اسلام کے سلسلے میں بھی کرنا ہے۔

مآخذ ومصادر

- Ghamdi on Aqamat e Deen......
- اقامتِ دین' مولانا وحید الدین
- اسلامی ریاست کا تصور' مولانا امین احسن اصلاحیؒ
- Implementation of Islam in State
- نفس کی غلامی
  Obehttp//:tarjumanulquran.org/site/publication_detail/1161
- Dience to Selfish Desires
- جمہوریت اور خلافت: تحقیقی جائزہ Democracy and Caliphate_ Analysis
- Caliphate and Democracy-An Analytical Review
- Asia became less democratic in 2017 ,report warns
- نفاذ شریعت اور حکمران ۔ مسئلہ تحکیم

حواشی وحوالہ جات

(۱) دستور جماعت اسلامی ہند' مرکزی مکتبہ اسلامی پبلشرز' دہلی' مئی ۲۰۱۶ء' ص ۷

(۲) ایضاً' ص ۸

(۳) سیّد ابوالاعلیٰ مودودی' تحریک آزادی ہند اور مسلمان' دوم' لاہور' ص ۱۷۵۔۱۷۶

(۴) سیّد ابوالاعلیٰ مودودی' تصریحات (مرتبہ: سلیم منصور خالد) لاہور' ص ۲۵۷۔۲۵۸

(۵) ایضاً' ص ۳۲۰ تا ۳۲۲

(۶) سیّد ابوالاعلیٰ مودودی' تفہیمات' سوم' اسلامک پبلی کیشنز' لاہور' ستمبر ۱۹۶۴ء' ص ۱۶۲۔۱۶۳

(۷) تعبیر کی غلطی' مولانا وحید الدین خان' مکتبہ الرسالہ' نئی دہلی' تیسرا ایڈیشن' اکتوبر ۱۹۸۶

(۸) سورۃ الشوریٰ کی آیت ۱۳ کی طرف اشارہ ہے: ﴿شَرَعَ لَكُمْ مِّنَ الدِّيْنِ مَا وَصّٰى بِهٖ نُوْحًا وَّالَّذِيْٓ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ وَمَا وَصَّيْنَا بِهٖٓ اِبْرٰهِيْمَ وَمُوْسٰى وَعِيْسٰٓى اَنْ اَقِيْمُوا الدِّيْنَ وَلَا تَتَفَرَّقُوْا فِيْهِ ۭ﴾ ''اُس نے تمہارے لیے دین کا وہی طریقہ مقرر کیا ہے جس کا حکم اُس نے نوحؑ کو دیا تھا' اور جسے (اے محمدﷺ!) اب تمہاری طرف ہم نے وحی کے ذریعے سے بھیجا ہے' اور جس کی ہدایت ہم ابراہیمؑ' موسیٰؑ اور عیسیٰؑ کو دے چکے ہیں' اِس تاکید کے ساتھ کہ قائم کرو

اس دین کو اور اُس میں متفرق نہ ہو جاؤ۔'' [ترجمہ مولانا مودودیؒ]

(۹) سورۂ صف کی آیت ۹ کی طرف اشارہ ہے: ﴿هُوَ الَّذِيْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ ۝﴾ ''وہی تو ہے جس نے اپنے رسولؐ کو ہدایت اور دینِ حق کے ساتھ بھیجا ہے تاکہ اسے پورے کے پورے دین پر غالب کر دے خواہ مشرکین کو یہ کتنا ہی ناگوار ہو۔'' [ترجمہ مولانا مودودیؒ]۔ یہی بات سورۂ توبہ کی آیت ۳۳ میں بھی کہی گئی ہے اور اس سے مشابہ مضمون سورۂ فتح کی آیت ۲۸ میں بھی آیا ہے: ﴿هُوَ الَّذِيْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ ۭ وَكَفٰى بِاللّٰهِ شَهِيْدًا ۝﴾ ''وہی تو ہے جس نے اپنے رسولؐ کو ہدایت اور دینِ حق کے ساتھ بھیجا ہے تاکہ اسے پورے کے پورے دین پر غالب کر دے اور اس حقیقت پر اللہ کی گواہی کافی ہے۔''

(۱۰) ڈاکٹر محمد رضی الاسلام ندوی' اقامتِ دین اور نفاذ شریعت' نئی دہلی' مئی ۲۰۱۲ء' ص ۱۰ تا ۱۸

(۱۱) مولانا صدرالدین اصلاحیؒ' خط مولانا صدرالدین' ماہنامہ تجلّی' دیوبند' فروری و مارچ ۱۹۶۵ء' ص ۵۱

(۱۲) جاوید احمد غامدی' تاویل کی غلطی' مجموعہ مقالات بُرہان' المورد' لاہور' ۲۰۱۰ء' ص ۱۶۹ تا ۱۸۰

(۱۳) مولانا گوہر رحمٰن' تفہیم المسائل' جلد پنجم' مکتبہ مدرسہ تفہیم القرآن' مردان' ۲۰۰۰ء' ص ۳۶۷ تا ۴۰۹

(۱۴) ڈاکٹر محمد رضی الاسلام ندوی' اقامت دین اور نفاذ شریعت' ص ۲۷ تا ۳۱

(۱۵) بیہقی' دارقطنی' البانی نے اسے حسن قرار دیا ہے۔

(۱۶) مسلم' كتاب الامارة' حديث: ۳۶۳۶

(۱۷) مسلم' كتاب الامارة' حديث: ۳۶۴۱

(۱۸) صحیح مسلم' كتاب الايمان' باب الدين النصيحه' رواه تميم الدارى' حديث: ۱۰۷

(۱۹) سنن ابن ماجه' باب امر بالمعروف و نهى عن المنكر' رواه ابو سعيد الخدرىؓ

(۲۰) صحیح مسلم' كتاب الامارة' روايت أم سلمةؓ

(۲۱) جاوید احمد غامدی' البیان' تفسیر سورۂ انفال آیت ۲۵

(۲۲) ابن ماجہ ۱۳/۱۲' نمبر ۳۹۹۹' مسند احمد ۱۹۵/۳۹' البانی نے اسے حسن قرار دیا ہے۔

(بشکریہ: ماہنامہ ترجمان القرآن' لاہور)

قرآن حکیم کی مقدس آیات اور احادیث نبویؐ آپ کی دینی معلومات میں اضافے اور دعوت وتبلیغ کے لیے شائع کی جاتی ہیں۔ ان کا احترام آپ پر فرض ہے۔ لہٰذا جن صفحات پر یہ آیات درج ہیں ان کو صحیح اسلامی طریقے کے مطابق بے حرمتی سے محفوظ رکھیں۔

ہوتا ہے جادہ پیما پھر کارواں ہمارا!

دعوت الی اللہ اور اظہار دین الحقّ علی الدّین کُلّہ

کے لیے ایک نئی اسلامی جماعت

تنظیم اسلامی

کے تاسیسی اجلاس منعقدہ ۲۷' ۲۸ مارچ ۱۹۷۵ء کی روداد

☆ جس دعوتِ اسلامی اور جہادِ فی سبیل اللہ کا عَلَم سید احمد شہید بریلویؒ اور شاہ محمد اسماعیل شہیدؒ نے انیسویں صدی کے وسط میں بلند کیا تھا اور جس کی خاطر شہیدین نے بالاکوٹ کے ویرانے کو اپنے اور اپنے رفقائے قدسی کے مقدس خون سے لالہ زار کیا تھا'

☆ جس اعلائے کلمۃ اللہ کی دعوت پر مجتمع ہونے کی پکار ۱۹۱۲ء میں ''الہلال'' اور ''البلاغ'' کے ذریعہ مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم نے بلند کی تھی'

☆ جس دعوت کی صدا ایک ربع صدی سے بھی زیادہ عرصہ تک ڈاکٹر علامہ محمد اقبال مرحوم نے اپنی اسلامی شاعری کے ذریعہ اُمتِ مرحومہ کو سنائی تھی اور مسلمِ خوابیدہ کو غفلت سے بیدار کرنے کے لیے حُدی خوانی کی تھی اور بانگ درادی تھی'

☆ جس شہادتِ حق علی الناس اور اقامتِ دین کی دعوت پر صاحبِ ''ترجمان القرآن'' مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی نے ۱۹۴۱ء میں اللہ کے چند مخلص بندوں پر مشتمل ایک قافلہ ترتیب دیا تھا جس نے راہِ حق میں عزیمت کے ساتھ پیش قدمی بھی شروع کی تھی' اور جس نے تمام وقتی و ہنگامی اور قومی وسیاسی مسائل سے صرفِ نظر کر کے وطن پرستی اور قوم پرستی کے پُرفتن دَور میں ٹھیٹھ اسلامی نہج پر دعوت کا آغاز کیا تھا' اور جس نے اپنی تاسیس کے ابتدائی آٹھ دس سالوں میں اپنے عمل سے عزیمت واستقامت اور حق واصول پسندی کی درخشاں نظائر قائم

کی تھیں لیکن جو خود چند مغالطوں اور غلط توقعات سے متاثر ہو کر رفتہ رفتہ اپنے موقف سے منحرف ہوتے ہوئے ایک اصولی وانقلابی جماعت کے مقام سے ہٹ کر ایک سیاسی وقومی پارٹی کے مقام تک پہنچ گئی تھی' جس پر فروری ۱۹۵۷ء کے ماچھی گوٹھ کے اجتماع میں ارکانِ جماعت کی عظیم ترین اکثریت نے مہرِ توثیق ثبت کر دی تھی'

اسی دعوتِ اسلامی' دعوتِ شہادت علی الناس' دعوت جہاد فی سبیل اللہ اور دعوتِ اظہارِ دینِ حق کی تجدید کے لیے اللہ تعالیٰ کی توفیق سے بحمد اللہ ''تنظیم اسلامی'' کے نام سے ایک اُصولی وانقلابی اسلامی جماعت کی ۱۳' ۱۴ ربیع الاول ۱۳۹۵ھ بمطابق ۲۷' ۲۸ مارچ ۱۹۷۵ء کو لاہور میں تاسیس وتشکیل ہوگئی۔

بِسْمِ اللّٰهِ مَجْرٖىهَا وَمُرْسٰىهَا ۭ اِنَّ رَبِّيْ لَغَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ○

۱۹۶۸ء کے اوائل میں اللہ کے ایک بندۂ عاجز ڈاکٹر اسرار احمد نے حلقۂ مطالعہ قرآن اور ایک منتخب قرآنی نصاب کے ذریعے' جس کی بنیاد سورۃ العصر ہے' دعوت رجوع الی القرآن شروع کی تھی۔ اس دعوت کا ماحصل یہ ہے کہ ہر فردِ بشر کی اُخروی نجات وکامرانی اور دُنیوی فوز وفلاح کا دارومدار ازروئے قرآن حکیم چار ناگزیر شرائط کو پورا کرنے پر ہے:

(۱) اللہ پر' رسالت پر' یوم آخرت پر اور ان ایمانیاتِ ثلاثہ کے تمام مقتضیات ومتضمنات پر ایمان لائے' جیسا کہ ایمان لانے کا حق ہے۔

(۲) اس ایمان کے تقاضوں کے مطابق انفرادی واجتماعی زندگی کے تمام اعمال اور معاملات کی اصلاح کرے' تا آنکہ زندگی کا ہر شعبہ نبی اکرم ﷺ کی لائی ہوئی ہدایت وشریعت کے تابع ہو جائے۔

(۳) دعوتِ حق کا جھنڈا اٹھا کر اظہار واقامتِ دین اور شہادت علی الناس' امر بالمعروف ونہی عن المنکر کا اجتماعی طور پر فرض انجام دینے کی خود بھی ہر امکانی سعی کرے اور دوسروں کو بھی اس کی تاکید اور وصیت کرے۔

(۴) راہِ حق میں پیش آنے والے مصائب وشدائد اور ابتلاء وآزمائش کو صبر وثبات اور استقامت ومصابرت سے خود بھی برداشت کرے اور اپنے دینی واسلامی اخوان کو بھی اسی کی تاکید اور وصیت کرے۔

یہ دعوت رجوع الی القرآن تطہیر افکار و اذہان اور تعمیر سیرت و کردار کا کام انجام دیتے ہوئے تقریباً ساڑھے چار سال کے بعد ۱۹۷۲ء کے وسط میں انفرادی سعی و کوشش کے دائرہ سے نکل کر ایک اجتماعی ادارہ ''مرکزی انجمن خدام القرآن'' کے تحت منظم ہوئی اور اس کی تاسیس و تشکیل عمل میں آئی۔ انجمن کی تشکیل و تاسیس کی قرارداد میں بھی اس نظریہ کو یوں ملحوظ رکھا گیا ہے:

''اسلام کی نشأۃِ ثانیہ اور غلبۂ دینِ حق کے دَورِ ثانی کا خواب اُمّتِ مُسلمہ میں تجدید ایمان کی عمومی تحریک کے بغیر شرمندۂ تعبیر نہیں ہوسکتا اور اس کے لیے لازم ہے کہ اوّلاً منبع ایمان و یقین یعنی قرآن حکیم کے علم و حکمت کی وسیع پیمانے پر نشر و اشاعت کی جائے۔''

گویا انجمن کی تشکیل سمع و طاعت کے ٹھیٹھ اسلامی اصول پر مبنی ایک اسلامی جماعت کے قیام کی تمہید تھی۔ ہر کام کے لیے اللہ تعالیٰ کی جانب سے ایک خاص وقت معیّن ہوتا ہے' کُلُّ امر مرھون باوقاتھا۔ چنانچہ قضائے الٰہی سے وہ مرحلہ بھی آ پہنچا جس میں ڈاکٹر اسرار احمد صاحب نے دعوت الی اللہ اور دعوتِ اظہار و اقامتِ دینِ حق کے لیے اسلامی اُصولوں پر ایک جماعت کی تشکیل کے لیے ۲۱ جولائی ۱۹۷۴ء کی شام کو اکیس روزہ قرآنی تربیت گاہ کے اختتامی اجلاس میں بایں الفاظ اپنے عزم کا اعلان کر دیا:

''اب بہت غور و فکر اور سوچ بچار کے بعد محض اللہ تعالیٰ کی تائید و توفیق پر توکّل اور بھروسے پر میں نے یہ فیصلہ کر لیا ہے کہ آئندہ میری زندگی میں یہ کام صرف درس و تدریس تک محدود نہیں رہے گا' بلکہ ان شاء اللہ العزیز احیائے اسلام اور غلبۂ دینِ حق ہی عملاً میری زندگی کا اصل مقصود ہوں گے۔ میری بہتر اور بیشتر مساعی بالفعل دعوتِ دین اور خلق خدا پر دینِ حق کی جانب سے اِتمامِ حجت میں صرف ہوں گی۔ گویا ''اِنَّ صَلَاتِیۡ وَنُسُکِیۡ وَمَحۡیَایَ وَمَمَاتِیۡ لِلّٰہِ رَبِّ الۡعٰلَمِیۡنَ ۝'' اور اسی کی دعوت مَیں اپنے تمام عزیزوں' دوستوں اور جاننے والوں حتیٰ کہ بزرگوں تک کو دوں گا۔ پھر جو لوگ اس راستے پر ساتھ چلنے کے لیے تیار ہو جائیں' انہیں ایک نظم میں منسلک کر کے ایک ہیئتِ اجتماعیہ تشکیل دوں گا جو اِن مقاصدِ عالیہ

کے لیے منظم جِدّ و جُہد کر سکے۔ وَمَا تَوۡفِیۡقِیۡۤ اِلَّا بِاللّٰہِ الۡعَلِیِّ الۡعَظِیۡمِ۔

(میثاق: ستمبر ۱۹۷۴ء ص ۵)

اس اعلان اور اظہارِ عزم کے بعد ابتدائی چند مہینے زیر تجویز اسلامی جماعت کے خدوخال اور اس کے اصولی نظریات و تصورات کی تبیین و تشریح میں صرف ہوئے۔ اس دوران لاہور اور کراچی میں قریبی رفقاء سے مجوزہ ''تنظیم اسلامی'' کے اساسی دستور اور اس کی ہیئت ترکیبی کے بارے میں تبادلہ خیال اور مشورے بھی ہوتے رہے۔ چنانچہ یہ طے کیا گیا کہ مارچ ۱۹۷۵ء کے آخری ہفتہ میں لاہور میں مرکزی انجمن خدام القرآن کے زیر اہتمام دوسری قرآن کانفرنس کے اختتام سے متصلاً بعد ''تنظیم اسلامی'' کی تاسیس کے لیے بھی اجتماع منعقد کر لیا جائے گا۔

قرآن کانفرنس کے آخری اجلاس میں ڈاکٹر صاحب نے اعلان کیا کہ نبی اکرم ﷺ کے اُسوۂ حسنہ کی پیروی اور ((فَلْیُبَلِّغِ الشَّاھِدُ الْغَائِبَ)) کے فرمانِ نبویؐ نیز ﴿کُنۡتُمۡ خَیۡرَ اُمَّۃٍ اُخۡرِجَتۡ لِلنَّاسِ تَاۡمُرُوۡنَ بِالۡمَعۡرُوۡفِ وَتَنۡہَوۡنَ عَنِ الۡمُنۡکَرِ﴾ (آلِ عمران:۱۱۰) کے ارشادِ ربانی کی تعمیل میں خالص اسلامی اُصولوں پر ''تنظیم اسلامی'' کی تاسیس و تشکیل کے لیے مرکزی انجمن کے دفتر میں ۲۷ اور ۲۸ مارچ کو اجتماعات منعقد ہوں گے۔ جن لوگوں کے دل میں اللہ تعالیٰ نے اس کام کے لیے تعاون اور عمل کا داعیہ پیدا کیا ہو' جو ہماری بنیادی تحریروں کا مطالعہ کر چکے ہوں' اور اُن سے بڑی حد تک مطمئن و متفق ہوں تو ایسے حضرات کل عصر کی نماز کے فوراً بعد مرکزی انجمن کے دفتر میں تشریف لے آئیں تا کہ دعوت الی اللہ' اعلائے کلمۃ اللہ' دعوت جہاد فی سبیل اللہ اور تواصی بالحق و تواصی بالصبر کے دینی فرائض کی انجام دہی کے لیے عزمِ نو کے ساتھ ایک قافلہ ترتیب دے کر راہِ حق میں گامزن ہونے کا فیصلہ ہو سکے۔

۲۷ مارچ ۱۹۷۵ء کو پہلے تاسیسی اجتماع میں ۱۰۳ حضرات شریک ہوئے جن میں لاہور' کراچی' سکھر' بہاولپور' ساہیوال' لائل پور' شیخوپورہ' گوجرانوالہ' واہ کے اصحاب شامل تھے۔ عصر کی نماز کے بعد اجتماع کی کارروائی کا آغاز ہوا۔

خطبہ مسنونہ اور ادعیہ ماثورہ کے بعد ڈاکٹر صاحب نے ان قرآنی آیات کی تلاوت کی:

﴿اِنَّمَا الۡمُؤۡمِنُوۡنَ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا بِاللّٰہِ وَرَسُوۡلِہٖ ثُمَّ لَمۡ یَرۡتَابُوۡا وَجٰہَدُوۡا بِاَمۡوَالِہِمۡ وَاَنۡفُسِہِمۡ فِیۡ سَبِیۡلِ اللّٰہِ ؕ اُولٰٓئِکَ ہُمُ الصّٰدِقُوۡنَ ﴿۱۵﴾﴾ (الحجرات)

﴿یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا ارْكَعُوْا وَاسْجُدُوْا وَاعْبُدُوْا رَبَّكُمْ وَافْعَلُوا الْخَیْرَ
لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ (٧٧) وَجَاهِدُوْا فِی اللّٰهِ حَقَّ جِهَادِهٖ ؕ هُوَ اجْتَبٰىكُمْ وَمَا
جَعَلَ عَلَیْكُمْ فِی الدِّیْنِ مِنْ حَرَجٍ ؕ مِلَّةَ اَبِیْكُمْ اِبْرٰهِیْمَ ؕ هُوَ سَمّٰىكُمُ
الْمُسْلِمِیْنَ ۙ۬ مِنْ قَبْلُ وَفِیْ هٰذَا لِیَكُوْنَ الرَّسُوْلُ شَهِیْدًا عَلَیْكُمْ وَتَكُوْنُوْا
شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ ۚ فَاَقِیْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ وَاعْتَصِمُوْا بِاللّٰهِ ؕ هُوَ
مَوْلٰىكُمْ ۚ فَنِعْمَ الْمَوْلٰى وَنِعْمَ النَّصِیْرُ (٧٨)﴾ (الحج)
﴿یُرِیْدُوْنَ لِیُطْفِـُٔوْا نُوْرَ اللّٰهِ بِاَفْوَاهِهِمْ وَاللّٰهُ مُتِمُّ نُوْرِهٖ وَلَوْ كَرِهَ
الْكٰفِرُوْنَ (٨) هُوَ الَّذِیْۤ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْهِرَهٗ عَلَى
الدِّیْنِ كُلِّهٖ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ (٩) یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا هَلْ اَدُلُّكُمْ عَلٰى
تِجَارَةٍ تُنْجِیْكُمْ مِّنْ عَذَابٍ اَلِیْمٍ (١٠) تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَتُجَاهِدُوْنَ فِیْ
سَبِیْلِ اللّٰهِ بِاَمْوَالِكُمْ وَاَنْفُسِكُمْ ؕ ذٰلِكُمْ خَیْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ (١١)
یَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ وَیُدْخِلْكُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ وَمَسٰكِنَ
طَیِّبَةً فِیْ جَنّٰتِ عَدْنٍ ؕ ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِیْمُ (١٢) وَاُخْرٰى تُحِبُّوْنَهَا ؕ نَصْرٌ مِّنَ
اللّٰهِ وَفَتْحٌ قَرِیْبٌ ؕ وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِیْنَ (١٣) یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْۤا اَنْصَارَ
اللّٰهِ كَمَا قَالَ عِیْسَى ابْنُ مَرْیَمَ لِلْحَوَارِیّٖنَ مَنْ اَنْصَارِیْۤ اِلَى اللّٰهِ ؕ قَالَ
الْحَوَارِیُّوْنَ نَحْنُ اَنْصَارُ اللّٰهِ فَاٰمَنَتْ طَّآئِفَةٌ مِّنْۢ بَنِیْۤ اِسْرَآءِیْلَ وَكَفَرَتْ
طَّآئِفَةٌ ۚ فَاَیَّدْنَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا عَلٰى عَدُوِّهِمْ فَاَصْبَحُوْا ظٰهِرِیْنَ (١٤)﴾ (الصف)

تلاوتِ آیات کے بعد ڈاکٹر صاحب نے مؤثر انداز میں خطاب فرمایا۔ خطاب کے اہم اقتباسات درج کیے جا رہے ہیں:

’’راہِ حق کے رفیقو! کافی انتظار کے بعد بالآخر وہ گھڑی آ پہنچی ہے جس میں ہم میں سے ہر ایک نہ صرف انفرادی اعتبار سے اپنی زندگی کا ایک اہم ترین فیصلہ کرنے چلا ہے بلکہ اللہ تعالیٰ کی تائید و نصرت اور توفیق سے یہ اجتماعی فیصلہ اسلام کی نشأۃِ ثانیہ‘ اُمّتِ مُسلمہ کے اِحیاء اور اللہ کے دین کے غلبہ اور اظہار کے سلسلہ

میں ایک تاریخی فیصلہ بھی ہو سکتا ہے۔ مَیں سمجھتا ہوں کہ اس اجتماع میں جو رفقاء شریک ہیں اُن کو اس بارے میں کوئی اشتباہ نہیں ہو گا کہ ایک بندۂ مومن سے دین کے تقاضے اور مطالبات کیا ہیں! دین کی جانب سے اس پر انفرادی اور اجتماعی زندگی میں کیا کیا فرائض عائد ہوتے ہیں؟ میرے نزدیک اگر کوئی کمی ہے تو وہ صرف ارادہ‘ عزمِ مصمم اور ایک فیصلہ کی کمی ہے۔ اس وقت ایسی دھن‘ لگن اور جذبہ کی ضرورت ہے کہ اب زندگی کو بہر حال اس رخ پر موڑ دینا ہے جو ہمارا مقصدِ وجود اور ہمارے رب کو مطلوب و محبوب ہے۔ ع ہر چہ بادا باد ما کشتی در آب انداختیم! یا ؎

بے خطر کود پڑا آتشِ نمرود میں عشق
عقل ہے محوِ تماشائے لبِ بام ابھی!

رفیقو! یہ فیصلہ کرنا کوئی آسان کام نہیں ہے۔ یہ فیصلہ جرأتِ مؤمنانہ کا تقاضا کرتا ہے‘ لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اگر انسان خلوص و اخلاص اور ایک عزمِ مصمّم کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی تائید و نصرت اور توفیق کے بھروسے پر اس کٹھن راہ پر ایک مرتبہ گامزن ہو جائے تو یہ اس کے لیے آسان بنا دی جاتی ہے۔ جیسا کہ فرمایا: ﴿وَالَّذِیْنَ جَاهَدُوْا فِیْنَا لَنَهْدِیَنَّهُمْ سُبُلَنَا ؕ﴾ (العنکبوت:٦٩) بھروسا اپنی قوت اور اپنے وسائل پر نہ ہو بلکہ صرف اللہ کی تائید و توفیق پر ہو۔ بندے کا کام صرف یہ ہو کہ اپنا سب کچھ راہِ حق میں لا کر ڈال دے۔ اپنی قوت و صلاحیت‘ توانائیاں‘ مال اور جان اسی کام کے لیے وقف کر دے۔ جیسا کہ کہا گیا: اَلسَّعْیُ مِنَّا وَالْاِتْمَامُ مِنَ اللّٰهِ۔ کوشش کرنا ہمارے ذمہ ہے‘ کسی کام کی تکمیل کر دینا ہمارے بس میں نہیں ہے۔ کسی کام کا اتمام و تکمیل کو پہنچنا سراسر اللہ کے اِذن اور اُس کے فیصلے پر منحصر ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ہر کام کے لیے ایک اجل معیّن کر رکھی ہے۔ ہم نہیں جانتے کہ دینِ حق کے بالفعل قائم اور جاری و ساری ہونے تک ابھی اللہ تعالیٰ کتنے قافلوں کو اُٹھائے جو کچھ دور تک چلیں‘ چند کٹھن

منازل طے کریں‘ اور پھر تھک ہار کر رہ جائیں۔ پھر کوئی دوسرا قافلہ ایک عزمِ نو کے ساتھ مترتب ہو‘ آگے بڑھے اور اس جِدّوجُہد کو کسی خاص حد تک لے جائے۔ ہم اس بارے میں کچھ نہیں جانتے۔ ہمارے لیے یہ جان لینا ہی ضروری ہے کہ ہم مسئول ہیں عزمِ مصمّم کرنے پر‘ سعی و جُہد پر۔ اس راہ کے کسی ایک مرحلے کی تکمیل بھی ہمارے بس میں نہیں ہے۔ یہ صرف اللہ تعالیٰ کی تائید و توفیق اور اس کی حکمت پر ہی منحصر ہے۔

اس اجتماع کے شرکاء میں شاید ہی کوئی ایسا شخص ہو جسے یہ اشتباہ لاحق ہو کہ ہمارے دین کے ہم سے تقاضے اور مطالبے کیا ہیں! مجھے توقع ہے کہ اس اجتماع میں وہی حضرات شریک ہوئے ہیں جنہوں نے ہماری دعوت کو اچھی طرح سمجھ لیا ہے اور ہماری تحریروں کا بغور مطالعہ کر لیا ہے۔ مَیں نے کل قرآن کانفرنس کے آخری اجلاس میں بھی عرض کر دیا تھا کہ جن حضرات نے ابھی ہماری تحریروں کا مطالعہ نہیں کیا تو وہ محض ایک تقریر سے متاثر ہو کر فیصلہ نہ فرمائیں۔ ایسے حضرات ابھی توقف فرمائیں۔ ذرا ٹھہریں‘ غور و فکر کریں‘ سوچ بچار کریں اور بہ نظر غائر ہماری تحریروں کا مطالعہ کر لیں۔ چند دنوں یا ہفتوں کی تاخیر و تعویق سے کوئی بڑا حرج واقع نہیں ہو گا۔

جو قافلہ اب افہام و تفہیم کے بعد ترتیب پا کر آگے چلنے کا فیصلہ کرے‘ اس میں شامل ہونے والوں کو ذہنی طور پر یکسو ہونا چاہیے۔ دعوت اپنے تمام مضمرات‘ مقتضیات‘ متضمنات اور مقدمات کے ساتھ شامل ہونے والے ہر ایک شخص کے سامنے ہو اور وہ پورے انشراحِ صدر کے ساتھ اس کو قبول کر رہا ہو۔ اسے معلوم ہو کہ اس دعوت کے تقاضے کیا ہیں! زندگی میں اسے کیا چھوڑنا اور کیا اختیار کرنا ہو گا؟ کس سے کٹنا اور کس سے جڑنا ہو گا؟ پھر یہ کہ اُمّتِ مُسلمہ میں اس دعوت کی نوعیت کیا ہو گی؟ احیاءِ دین کی جدّوجُہد میں اس نئی جماعت کا خصوصی نہج اور طریق کار کیا ہو گا؟ احیاءِ دین کے نام سے

چلنے والی دوسری دینی تحریکوں سے یہ دعوت کس کس پہلو سے ممیز ہے؟ جب تک یہ تمام امور واضح نہ ہوں‘ اس وقت تک کسی فوری جذبہ اور داعیہ کے تحت شامل ہو جانے والا شخص غیر مطمئن حالت سے دوچار رہے گا۔ ایسا انسان ایک قدم چل کر ٹھٹکے گا‘ سوالات پیدا کرے گا‘ الجھنیں سامنے لائے گا۔

رفیقو! مجھے پورا احساس ہے کہ یہ راہ جس پر گامزن ہونے کے لیے ایک جذبۂ صادق اور عزمِ صمیم کے ساتھ ہم ایک قافلہ کی شکل اختیار کرنے کے لیے جمع ہوئے ہیں‘ بڑی کٹھن اور پُرصعوبت ہے۔ اس راہ پر چلنے کے لیے ع ’’چیتے کا جگر چاہیے‘ شاہین کا تجسّس‘‘۔ بفحوائے آیۂ قرآنی: ﴿اِنَّ ذٰلِكَ مِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ ⑰﴾ (لقمٰن) ’’بے شک یہ بہت ہی ہمت کے کاموں میں سے ہے۔‘‘ لیکن اُس کے ساتھ ہی وہ خوش خبری بھی پیش نظر رکھیے کہ ہمارے ربّ نے ہم سے وعدہ فرمایا ہے: ﴿وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا﴾ ’’اور جو لوگ ہماری راہ میں (لگیں گے‘ کھپیں گے) جدّوجُہد کریں گے ان کو ہم یقیناً اپنے راستوں کی ہدایت دیں گے۔‘‘ مزید یہ کہ اس راہ میں کھپ جانے والوں‘ اپنی جان کی توانائیاں لگانے والوں‘ اپنے گاڑھے پسینہ کی کمائی کو صرف کرنے والوں کو اللہ تعالیٰ اپنا ’’انصار‘‘ قرار دیتا ہے۔ ایک بندۂ عاجز کے لیے اس سے بڑا اعزاز اور کوئی ہو ہی نہیں سکتا کہ اُس کا ربّ‘ اُس کا آقا و مالک اور اُس کا خالق اس کو اپنا ’’انصار‘‘ قرار دے۔ ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ۔‘‘

اس افتتاحی خطاب کے بعد ڈاکٹر صاحب نے فرمایا:

’’تنظیم اسلامی کے قیام کے لیے وہی قراردادِ تاسیس پیش کی جائے گی اور اس قرارداد کی ’’توضیحات‘‘ بھی وہی پیش ہوں گی جو آج سے تقریباً ساڑھے آٹھ سال قبل مرتّب کی گئی تھیں۔ اس قرارداد اور توضیحات پر نظر ثانی کی جاتی تو اسے مزید بہتر بنایا جا سکتا تھا‘ لیکن میری خواہش ہے کہ ہماری اس تنظیم کا تعلق ماضی کی

اُس کوشش سے قائم اور باقی رہے جس میں ہمارے چند قابلِ احترام بزرگ شامل تھے اور جن کے ساتھ مَیں بھی وابستہ تھا۔ مجھے اس پر پورا اطمینان ہے کہ یہ قرارداد اور اس کی توضیحات ایک دینی و اسلامی تنظیم کا صحیح و مکمل ہیولہ اپنے اندر رکھتی ہے۔ یہ قرارداد اور توضیحات آج اس اجتماع میں پیش ہوں گی۔ اس وقت ان پر کوئی ردّ وقدح نہیں ہوگی۔ جو حضرات اس قرارداد اور اس کی توضیحات سے کامل اتفاق رکھتے ہوں وہ اس لحاظ سے ممیّز و ممتاز ہو کر ایک قدم آگے آجائیں گے کہ قائم ہونے والی ’’تنظیم اسلامی‘‘ کے بنیادی تصورات و نظریات کو انہوں نے قبول کر لیا ہے۔ دوسرے مرحلہ میں وہی حضرات شریک ہوں گے جو اس پہلے مرحلہ سے کامل اتفاق رکھتے ہوں گے۔

دوسرے مرحلہ پر ہم تنظیم کے دستورِ اساسی کے پہلے حصّہ پر غور کریں گے‘ جو عقیدے کے مباحث پر مشتمل ہے۔ اس سے ہمارے دینی نظریات و تصورات اور دینی فرائض ایک دوسرے رُخ اور پہلو سے سامنے آئیں گے۔ اس پر بھی آج کی نشست میں بحث و تمحیص نہیں ہوگی‘ البتہ اگر کوئی مناسب لفظی ترمیم آئی یا کوئی نئی مفید تجویز پیش کی گئی تو اس کو قبول کیا جاسکے گا۔ پھر جو لوگ اس عقیدے اور نظریات والے حصّہ سے بھی مطمئن ہوں گے تو وہ گویا اس لحاظ سے مزید ممتاز ہو کر سامنے آئیں گے کہ وہ اس اسلامی تنظیم کے اساسی عقائد و نظریات کو قبول کرتے ہیں۔

اس کے بعد صرف تنظیمی ڈھانچے کی ترتیب کا مرحلہ باقی رہ جائے گا۔ ان شاء اللہ‘ کل جو اجتماع ہوگا‘ اس میں یہ تنظیمی ڈھانچا بھی رفقاء کے لیے پیش کر دیا جائے گا۔ کل کے اجتماع میں صرف وہ حضرات شریک ہو سکیں گے جو آج کے اجتماع کے دونوں مرحلوں کو طے کر کے یہ تسلیم کریں گے کہ ان کو ان مراحل کے بارے میں انشراحِ صدر حاصل ہو چکا ہے اور انہیں کوئی تردّد باقی نہیں رہا۔ مجھے یقین ہے وہ تمام حضرات جو آج اس اجتماع میں شریک ہیں‘ اس طریق کار سے

اتفاق کریں گے۔

رفیقو! ہماری اس تنظیم کی سب سے اہم اور سب سے عظیم خصوصیت یہ ہے کہ اس کی اساس ’’دعوتِ رجوع الی القرآن‘‘ پر قائم ہے۔ اس کا پہلا مرحلہ وہ تھا کہ جب قرآن حکیم کے ذریعہ دعوت‘ تبلیغ‘ انذار‘ تبشیر‘ تذکیر‘ تزکیہ و تطہیرِ افکار و اعمال کا کام انجام دیا گیا۔ لوگوں کے سامنے یہ بات واضح کی گئی کہ منبع ایمان اور سرچشمۂ یقین قرآن حکیم ہی ہے۔ دلوں میں حقیقی یقین بھی اسی سے پیدا ہوگا‘ تربیت اسی سے ہوگی‘ تعلیم اسی سے حاصل ہوگی۔ عمل کا داعیہ اسی کی دعوت و تبلیغ سے بیدار ہوگا۔ دُنیوی فوز و فلاح اور اُخروی نجات کا ذریعہ بھی یہی کتاب اللہ[1] ہے۔

یہ خصوصیت ہماری دعوت کو دوسری تمام دینی تحریکوں اور دعوتوں سے ممتاز کرنے والی چیز ہے۔ ان شاء اللہ العزیز‘ ہماری تنظیم کا اوڑھنا بچھونا اللہ کی کتاب ہی رہے گی۔ ہماری ساری جدّ وجُہد میں رہنمائی کا مقام اسی هُدًى لِّلنَّاس کو حاصل رہے گا۔

البتہ یہ بات پیش نظر رہنی ضروری ہے کہ یہ اساسی طریق کار ہے۔ دعوت و تبلیغ اور تزکیہ و تربیت کے لحاظ سے تو قرآن حکیم ہی سب کچھ ہے لیکن بات یہاں ختم نہیں ہوتی۔ اس کے ساتھ تنظیم کا مرحلہ آتا ہے۔ تنظیم کے بعد جہاد کے مراحل شروع ہوتے ہیں۔ ان مراحل میں مدافعت (Passive Resistance) بھی ہے اور اقدام (Active Resistance) بھی ہے۔ پھر ہجرت کا مرحلہ بھی آتا ہے۔ قتال اس راہ کی بلند ترین منزل ہے‘ جس میں احقاقِ حق اور ابطالِ باطل

(۱) مبادا کوئی غلط فہمی راہ پائے یا دانستہ پھیلائی جائے‘ لہٰذا اس موقع پر اس امر کی وضاحت ضروری ہے کہ ہمارے نزدیک قرآن حکیم وحی متلو ہے اور حدیث شریف وحی غیر متلو۔ حدیث شریف‘ قرآن مجید سے کوئی جدا چیز نہیں ہے بلکہ وہ اسی کی تشریح و تبیین ہے۔ ہمارا ایمان ہے کہ کتاب و سُنّت ایک وحدت ہیں۔

کے لیے نقدِ جاں کی نذر گزارنی ہوتی ہے۔ یہی معراجِ مؤمن ہے کہ:

جاں دی، دی ہوئی اُسی کی تھی
حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا!

اور ؎

شہادت ہے مطلوب و مقصودِ مؤمن
نہ مالِ غنیمت نہ کشور کشائی!

یہ تمام مراحل وہ ہیں جن کے لیے ایک منظم جماعت کی ضرورت ناگزیر ہے، جیسا کہ حضور ﷺ نے فرمایا:

((اَنَا آمُرُکُمْ بِخَمْسٍ: بِالْجَمَاعَةِ وَالسَّمْعِ وَالطَّاعَةِ وَالْھِجْرَةِ وَالْجِھَادِ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ))

رفیقو! مَیں اس وقت بہت مضمحل ہوں۔ اس کا باعث یہ احساس ہے کہ ایک بہت بڑی ذمہ داری کا بوجھ مَیں نے اپنے ناتواں کاندھوں پر اٹھایا ہے۔ من آنم کہ من دانم۔ حقیقت یہ ہے کہ اگر محاسبۂ اُخروی کا شدید احساس نہ ہوتا تو مَیں یہ ذمہ داری اُٹھانے کے لیے ہرگز آمادہ نہ ہوتا۔ ادائیگی فرض کے احساس ہی نے دراصل مجھے یہ ذمہ داری اُٹھانے پر آمادہ کیا ہے۔ میرے مطالعے، علم اور میری عقل وفہم کی حد تک ایسی تنظیم جس شخص کی دعوت پر ہیئتِ اجتماعیہ اختیار کرتی ہے، وہی شخص اس تنظیم کا فطری سربراہ ہوتا ہے۔ میرے اس خیال کی بنیاد سُورۃ الصف کی آخری آیت کا یہ ٹکڑا ہے کہ: مَنْ اَنْصَارِیْٓ اِلَی اللّٰہِ ط

میرے نزدیک ہماری دعوتِ اسلامی کی ہیئتِ اجتماعیہ میں یہ اُصول بھی دوسری دینی و اسلامی جماعتوں کے مقابلے میں ایک بنیادی فرق رکھتا ہے۔ چنانچہ اِس اُصول کے تحت جو بوجھ میرے کاندھوں پر آ رہا ہے، اس کے احساسِ ذمہ داری نے بھی مجھے لرزاں وترساں کر رکھا ہے۔ مجھے اِس بوجھ کو اُٹھانے کا ہرگز شوق نہیں ہے۔ مَیں اگر اسے اٹھانے کے لیے تیار ہو رہا ہوں تو صرف اپنے

احساسِ فرض کی بنیاد پر۔ جن فرائض کا شعور مطالعہ قرآن حکیم کے منتخب نصاب اور قرآنِ حکیم کے مختلف مقامات کے دروس وخطابات کے ذریعہ مَیں نے آپ حضرات کے ذہن میں اُجاگر کرنے کی کوشش کی ہے، وہ شعور سو گنا سے بھی زیادہ مجھے حاصل ہے اور فرض و ذمہ داری کا احساس سامعین کے مقابلے میں سو گنا مجھ پر واضح ہے۔ یہ احساس وشعور مجھ پر اس درجہ واضح نہ ہوتا تو مَیں آپ تک منتقل نہ کر پاتا۔ یہ بھی عرض کر دوں کہ میں کتنی بھی کوشش کروں، شاید اس گہرے احساسِ ذمہ داری کو پھر بھی کماحقہٗ آپ پر واضح نہ کر پاؤں جس سے مَیں دوچار ہوں، جس کی وجہ سے مَیں نوجوانی کے دَور سے اب تک ایک سیماب وَش زندگی بسر کرتا رہا ہوں۔ اسلامی جمعیت طلبہ میں یہی احساسِ فرض لے کر گیا۔ جماعتِ اسلامی میں اسی فرض کی ادائیگی کے لیے شمولیت اختیار کی، لیکن جب اُس نے اپنے انتقال و انحرافِ موقف سے دعوت وعزیمت کی راہ چھوڑ کر ایک نیم دینی و نیم سیاسی قومی جماعت کی ہیئت اختیار کر لی تو اسی احساسِ فرض کی وجہ سے مَیں نے اُس کو خیرباد کہا۔ پھر دیوانہ وار اس تلاش وجستجو میں رہا کہ دعوت اِلی اللہ کے لیے کوئی قافلہ ترتیب پائے تو مَیں اُس میں شامل ہو جاؤں۔ اسی مقصد کے لیے پے در پے سفر اختیار کیے۔ پالیسی سے اختلاف کے باعث جماعتِ اسلامی سے علیحدہ ہونے والے اکابر سے مسلسل رابطہ قائم کیا اور ان کو ایک نئی دینی جماعت کی تاسیس و تشکیل کے لیے آمادہ کرنے کی پیہم سعی وجہد کی۔ میری خواہش یہ تھی کہ یہ اکابر آگے بڑھیں اور دعوتِ اسلامی کے لیے ایک ہیئتِ اجتماعیہ تشکیل دیں تاکہ مَیں ایک ادنیٰ خادم اور کارکن کی حیثیت سے اِس میں کھپ سکوں۔ یوں اپنے اُن فرائض دینی کی انجام دہی کر سکوں جو مجھ پر قرآن حکیم کے مطالعہ اور چند اہل قلم حضرات کے لٹریچر سے واضح ہو چکے تھے۔ اسی مقصد کے لیے مَیں نے کئی بار انتقالِ مکانی کیا۔ کبھی ساہیوال سے کراچی، کبھی کراچی سے ساہیوال اور کبھی ساہیوال سے لاہور منتقل ہوا۔ اس عرصہ میں اپنی سوچ کے مطابق مَیں نے چند

کاموں کی داغ بیل بھی ڈالی لیکن طبیعت کو اطمینان حاصل نہیں ہوا۔ چنانچہ خوب سے خوب تر کی تلاش جاری رہی۔ ۱۹۶۶ء کے اواخر میں از سرِنو کوشش کی کہ جماعتِ اسلامی سے علیحدہ ہونے والے وہ اکابر آگے بڑھیں جو انفرادی طور پر مختلف دینی کاموں میں مشغول تھے اور ایک نئی دینی جماعت کے قیام کے لیے اقدام فرمائیں۔

چنانچہ اسی کے پیشِ نظر اپنا وہ بیان ’’تحریک جماعتِ اسلامی: ایک تحقیقی مطالعہ‘‘ کے نام سے شائع کیا جو مَیں نے بحیثیت رکن جماعتِ اسلامی اکتوبر ۱۹۵۶ء میں جائزہ کمیٹی کو پیش کیا تھا۔ ’’میثاق‘‘ میں ’’نقضِ غزل‘‘ کے عنوان سے ایک سلسلۂ مضمون شروع کیا‘ جس میں جائزہ کمیٹی کی رپورٹ (دسمبر ۱۹۵۶ء) سے اجتماعِ ارکان ماچھی گوٹھ (فروری ۱۹۵۷ء) تک پیش آمدہ حالات و واقعات اور ان کا تجزیہ پیش کیا گیا تھا۔ ان تمام مساعی کا نتیجہ یہ نکلا کہ چند اکابر اور مجھ جیسے چند اصاغر ۱۹۶۷ء میں رحیم یار خاں میں جمع ہوئے جہاں ’’تنظیم اسلامی‘‘ کے نام سے ایک ہیئت اجتماعی کے قیام و تشکیل کے لیے وہ قرارداد اور اس کی توضیحات منظور کی گئیں‘ جو ان شاء اللہ اسی اجتماع میں ہم پڑھیں گے۔ اللہ تعالیٰ کی مشیت میں ابھی اس تنظیم کے قیام کا فیصلہ نہیں ہوا تھا‘ لہٰذا یہ کوشش بار آور نہ ہوسکی۔ اس کوشش کی ناکامی کے بعد میں نے فیصلہ کرلیا کہ اب جو کچھ کرنا ہے‘ اللہ تعالیٰ کی تائید و توفیق کے بھروسے پر اور اپنی قوت‘ استعداد اور صلاحیت کی بنا پر تن تنہا خود شروع کرنا ہے۔

مَیں بطور تحدیثِ نعمت عرض کرتا ہوں کہ جماعتِ اسلامی سے علیحدہ ہونے کے بعد بحمد اللہ گزشتہ سترہ اٹھارہ سالوں کے دوران مجھ پر کوئی ایک دن بھی ایسا نہیں گزرا کہ میری نگاہوں سے احیائے اسلام اور اقامتِ دین کا بلند و بالا نصب العین اوجھل ہوا ہو یا مجھے اپنے ان دینی فرائض کے بارے میں کوئی شک یا شبہ

لاحق ہوا ہو۔ میں ایک دن بھی یہ سبق نہیں بھولا کہ اظہارِ دینِ حق کی سعی و جہد ہر باشعور مسلمان کے لیے فرضِ اوّلین کا مقام رکھتی ہے۔ بڑی سے بڑی دین داری‘ بڑی سے بڑی تہجد گزاری‘ زیادہ سے زیادہ نفلی عبادات اجر و نتیجہ کے لحاظ سے بے اصل اور بے وزن ہیں جب تک اُن کے ساتھ تواصی بالصبر‘ احقاقِ حق اور ابطالِ باطل‘ اظہارِ دین اور اقامتِ دین‘ احیائے اسلام اور شہادتِ حق علی الناس کے فرائض کی ادائیگی کی جدّوجُہد نہ ہو۔ یہ اُمور فرائضِ دینی میں شامل ہیں‘ جن کے بغیر نجات کی اُمید‘ اُمیدِ موہوم سے زیادہ وقعت نہیں رکھتی۔

فرائض کا جو تصوّر ہمارے ہاں رائج ہو چکا ہے‘ کہ نماز‘ روزہ‘ حج اور زکوٰۃ ہی بس فرائضِ دینی ہیں‘ تو دراصل یہ اسلام کے فقہی اور قانونی فرائض ہیں‘ جو بلاشبہ صحیح اور حقیقی فرائض ہیں۔ فرائض کے حوالے سے یہ نظریات و تصوّرات ہمارے ائمہ وفقہاء ؒ نے اُس دَور میں مدوّن کیے ہیں کہ جب اسلام ایک غالب اور عالمگیر قوت کی حیثیت سے دنیا میں موجود تھا۔ کُرۂ ارضی کے ایک قابلِ ذکر حصّہ پر شریعتِ اسلامی اور نظامِ قرآنی بالفعل قائم و نافذ تھا۔ اُس دَور میں اقامتِ دین کی سعی وجدّ و جُہد فرائض کی فہرست میں داخل نہیں تھی‘ اس کی وجہ سمجھ میں آتی ہے لیکن جب حق غالب نہ ہو‘ اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی اور خاتم النبیّین والمرسلین جناب محمد ﷺ کی لائی ہوئی شریعت نافذ نہ ہو‘ اِنِ الۡحُکۡمُ اِلَّا لِلّٰہِ کا اٹل اُصول ہمارے تمام دُنیوی اُمور میں جاری و ساری نہ ہو‘ اس وقت ان فرض عبادات کی ادائیگی کے ساتھ ساتھ سب سے اہم فرض حق کو غالب کرنے کی سعی وجُہد کرنا ہے۔ یہ ہے وہ گہرا احساسِ فرض جس کی بنا پر مَیں نے آپ کو پکارا ہے کہ مَنۡ اَنۡصَارِیۡۤ اِلَی اللّٰہِ!

جب حق مغلوب ہو تو وہ شخص ہرگز حقیقی دین دار نہیں ہے جس کی توانائیاں دنیا کمانے میں صرف ہو رہی ہوں‘ چاہے وہ حلال و حرام کی قیود کی پوری پابندیوں کو ملحوظ رکھ کر ہی کمائی کر رہا ہو۔ جب حق غالب نہ ہو‘ ایک معاشرے میں

اللہ کی شریعت نافذ نہ ہو‘ تو میرے نزدیک ازروئے قرآن حکیم ایک سچے اور حقیقی مسلمان کا اوّلین فرض بلکہ اس کی غیرت وحمیتِ دینی کا اوّلین تقاضا اظہارِ دینِ حق‘ اعلائے کلمۃ اللہ اور اَمر بالمعروف و نہی عن المنکر کی جدّوجُہد ہے۔ اگر پُرمعصیت ماحول میں اُس کا دم نہیں گھٹتا‘ چین اور آرام حرام نہیں ہو جاتا‘ بلکہ وہ دنیا کی کمائی یا انفرادی زُہد وعبادت ہی کو کافی سمجھتا ہے تو ایسے شخص کو یہ حدیث قدسی پیشِ نظر رکھنی چاہیے جو ہر اُس مسلمان کو جس کے دل میں ذرّے کے برابر بھی ایمان ہے‘ لرزاں وترساں کرنے والی ہے:

قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ: ’’اَوْحَی اللّٰہُ عَزَّوَجَلَّ اِلٰی جِبْرِیْلَ علیہ السلام اَنِ اقْلِبْ مَدِیْنَۃَ کَذَا وَکَذَا بِاَھْلِھَا‘‘ قَالَ فَقَالَ: ’’یَا رَبِّ اِنَّ فِیْھَا عَبْدَکَ فُلَانًا لَمْ یَعْصِکَ طَرْفَۃَ عَیْنٍ‘‘ قَالَ فَقَالَ: ’’اِقْلِبْھَا عَلَیْہِ وَعَلَیْھِمْ فَاِنَّ وَجْھَہٗ لَمْ یَتَمَعَّرْ فِیَّ سَاعَۃً قَطُّ‘‘

(رواہ البیہقی بحوالہ خطبات الاحکام تالیف مولانا اشرف علی تھانوی)

’’رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ ’’اللہ تعالیٰ نے جبرائیل علیہ السلام کو حکم فرمایا کہ فلاں فلاں بستیوں کو ان کے رہنے والوں سمیت اُلٹا دو۔‘‘ حضور ﷺ نے فرمایا کہ ’’اِس پر حضرت جبرائیلؑ نے عرض کیا کہ پروردگار! ان میں تو تیرا فلاں بندہ بھی ہے جس نے چشم زدن کی مدت بھی تیری معصیت میں بسر نہیں کی! آنحضور ﷺ نے فرمایا کہ اس پر اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا کہ ’’اُلٹ ڈالو نہیں پہلے اس پر پھر دوسروں پر‘ اس لیے کہ اس کے چہرے کی رنگت کبھی میری (غیرت اور حمیت کی) وجہ سے متغیر نہیں ہوئی۔‘‘

تواصی بالحق اور اقامت واظہارِ دینِ حق کی جدّوجُہد‘ سعی وکوشش اور کشمکش کے ساتھ دوسرے فرائض دینی کی ادائیگی بلاشبہ موجبِ اجروثواب ہے جو بلاشبہ ارکانِ اسلام ہیں۔ اس بات کو مزید سمجھنے کے لیے سورۃ الحجرات کی یہ آیت اپنے ذہن میں تازہ کر لیجیے:

﴿اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰہِ وَرَسُوْلِہٖ ثُمَّ لَمْ یَرْتَابُوْا وَجٰھَدُوْا

بِاَمْوَالِھِمْ وَاَنْفُسِھِمْ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ ۭ اُولٰۗئِکَ ھُمُ الصّٰدِقُوْنَ ﴿۱۵﴾﴾

’’بلاشبہ مومن تو بس وہ لوگ ہیں جو ایمان لائے اللہ پر اور اُس کے رسولؐ پر‘ پھر کسی شک اور ریب میں نہیں پڑے‘ اور جنہوں نے جہاد کیا اپنے مالوں کے ساتھ اور جانوں کے ساتھ اللہ کی راہ میں۔ پس یہی لوگ (اپنے دعوائے ایمان میں) سچے ہیں۔‘‘

رفیقو! آج کے اس اجتماع میں کوئی تقریر کرنا میرے پیشِ نظر نہیں تھا۔ اسی لیے ذہن میں کوئی مربوط خاکہ مرتب بھی نہیں کیا تھا۔ البتہ جب بات نکلی تو نکلتی چلی گئی۔ مَیں نے چاہا تھا کہ جس شدید احساسِ ذمہ داری نے مجھے یہ بوجھ اٹھانے پر آمادہ کیا ہے‘ اسے آپ کے سامنے بیان کر دوں۔ میرے اندر کبھی کسی وقت نمایاں ہونے کا جذبہ رہا ہو تو مَیں اُس سے انکار نہیں کرتا۔ میں بھی گوشت پوست سے بنا ہوا ایک انسان ہوں۔ مَیں نے چھوٹی سطح پر لیڈری بھی کی ہے۔ اسلامی جمعیت طلبہ میں یہ شوق پورا کر چکا۔ اُسی دَور میں مجھے بحمد اللہ یہ شعور حاصل ہوا کہ سستی قسم کی شہرت اور لیڈری‘ جس کے لیے قلم سے کچھ لکھنا اور زبان سے کچھ بولنا ہی کفایت کرتا ہے اور اسی کے بل بوتے پر انسان اپنی لیڈری کی دکان سجا کر بیٹھ جاتا ہے‘ اس سے زیادہ مہلک شے اور کوئی نہیں ہے۔ لیڈری اور شہرت پسندی کے مہلک مرض کو مَیں نے اس کی ابتدائی حالت ہی میں دیکھ لیا تھا اور اپنے لیے متعین طور پر یہ طے کر لیا تھا کہ اس راستہ پر ہرگز نہیں چلوں گا‘ حالانکہ مجھ میں اس کی صلاحیت تھی۔ تقریر کرنی اور مضمون نویسی مجھے اس وقت بھی آتی تھی۔ لوگوں کو وقتی طور پر متاثر کرنے کا فن بھی آتا تھا۔ یہ استعداد مجھ میں قدرت کی ودیعت کردہ تھی لیکن مَیں نے شعوری طور پر فیصلہ کیا کہ اس راستہ پر نہیں چلنا۔

۱۹۵۴ء سے اب تک بیس اکیس سال کا بڑا طویل دَور ہے۔ مجھے شوقِ خودنمائی اور ذوقِ قیادت ہوتا اور دنیا طلبی وشہرت پسندی اور طالع آزمائی مقصودِ نظر ہوتی تو مَیں بھی کہیں نہ کہیں اپنی قیمت چکوا چکا ہوتا اور بہتی گنگا میں ہاتھ دھو چکا ہوتا۔ لیکن

میں ہراُس راستہ اور ہراُس موڑ سے شعوری طور پر بچ کر نکلنے کی کوشش کرتا رہا جو دنیا طلبی اور جاہ طلبی کا راستہ تھا' وما توفیقی الا باللہ۔

مجھے اگر سیاست کا کوئی کھیل کھیلنے کا شوق ہوتا تو میرے پاس اس کے بھی مواقع آئے۔ ہرگز یہ نہ سمجھئے کہ مجھے سیاسی کروٹوں کا علم نہیں رہا ہے اور مجھے معلوم نہیں تھا کہ اب سیاسی صورتِ حال کس رُخ پر جا رہی ہے۔ مَیں نے ۱۹۶۸ء اور ۱۹۶۹ء میں ''میثاق'' کے صفحات پر جو سیاسی تجزیے لکھے تھے' اُن کا آپ اب مطالعہ کریں تو معلوم ہوگا کہ مجھے اُس وقت ہی اندازہ ہوگیا تھا کہ حالات میں کیا تبدیلی آنے والی ہے۔ کون سا سورج ڈوب رہا ہے اور کون سا نیا سورج طلوع ہو رہا ہے۔ اگر لیڈری اور دنیا طلبی میرا مقصود ہوتا تو اس وقت مَیں کوئی نہ کوئی معاملہ کر سکتا تھا۔ الحمدللہ' ثم الحمدللہ کہ جو سبق مَیں نے قرآنِ حکیم اور جماعتِ اسلامی کے لٹریچر سے سیکھا تھا' اُس سبق کے سوا اور اُس مقصد کے سوا' اور اُس ذمہ داری کے سوا کبھی کوئی دوسری چیز اور کوئی ترغیب و تحریص مجھے اپنی طرف مائل نہ کر سکی۔

انسان اپنے تحت الشعور کی گہرائیوں کو ناپ نہیں سکتا۔ مَیں اس بات کا مدعی نہیں کہ میں ان گہرائیوں کو ماپ سکتا ہوں۔ میرے تحت الشعور میں کہیں کوئی اور غرض (motive) بھی موجود ہو تو مَیں کہہ نہیں سکتا۔ البتہ اپنے شعور کو جہاں تک ٹٹول سکتا ہوں' اُس کا جائزہ لے سکتا ہوں' اُس کا تجزیہ کر سکتا ہوں تو اس کے پیشِ نظر مَیں پورے انشراحِ صدر کے ساتھ اللہ کو حاضر و ناظر جان کر اور اُسے گواہ بنا کر عرض کرتا ہوں کہ کوئی شوقِ انجمن آرائی' کوئی ذوقِ جماعت سازی اور کوئی جذبہ حب تفوّق کا' جاہ طلبی کا' لیڈری کا اور سیاست بازی کا بحمداللہ پیشِ نظر نہیں ہے۔

اگر اس کام کی فرضیت کا احساس اتنا شدید نہ ہوتا اور کوئی دوسری جماعت اجتماعی طور پر اس فریضۂ دینی کی انجام دہی کی جدوجہد کرنے کے لیے موجود ہوتی تو مَیں کبھی بھی اس بوجھ کو اٹھانے کی جرأت نہ کرتا۔ آج میرے اعصاب میں ارتعاش ہے' میرے قویٰ مضمحل ہیں۔ اس بوجھ کی ذمہ داری کا شدید احساس مجھ پر طاری

ہے لیکن بایں ہمہ مَیں نے اس کو اٹھانے کا فیصلہ صرف اس لیے کیا ہے کہ اس کے سوا مجھے کوئی چارۂ کار نظر نہیں آتا۔

جز دار اگر کوئی مفر ہو تو بتاؤ
ناچار گنہ گار سوئے دار چلے ہیں!

یہ بوجھ کسی شوق میں نہیں اٹھایا جا رہا بلکہ احساسِ فرض اور شعورِ ذمہ داری و مسئولیت کے تحت اٹھایا جا رہا ہے۔

رفیقو! اس تنظیم کی تشکیل بالکل فطری انداز میں ہو رہی ہے۔ میں اس کو علیٰ وجہ البصیرت غلط سمجھتا ہوں کہ یہ کہوں کہ میرا کام آپ کو جمع کر دینا تھا' اب آپ اپنے میں سے کسی اہل ترین شخص کو اپنا امیر منتخب کر لیجیے۔ یہ پکار مَیں نے لگائی ہے' یہ دعوت مَیں نے دی ہے۔ میری صدا پر آپ نے لبیک کہا ہے۔ لہٰذا ذمہ داری کا بوجھ بھی مجھے ہی اٹھانا ہے۔ مَیں ہی اس کو آگے لے کر چلوں گا۔ مَیں آپ سے اس کام میں تعاون کا' نصرت کا اور امداد و اعانت کا طلب گار ہوں۔ ساتھ ہی باصرار آپ سے عرض کرتا ہوں کہ جو میرا ساتھ دے وہ اس بات کو بھی اپنی دینی ذمہ داری سمجھے کہ جہاں مجھے غلط ہوتا دیکھے' مجھے سیدھا کرنے کی کوشش کرے۔ میرا محاسبہ کرے اور کوئی رُو رعایت نہ کرے۔ یہ آپ کا حق ہی نہیں بلکہ فرض ہوگا۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ اِس وقت جو ساتھ چلنے کا فیصلہ کرے وہ یکسو اور یک رنگ ہو کر کرے۔ پورے انشراحِ صدر کے ساتھ قافلہ میں شامل ہو۔ ہماری تنظیم کے خدوخال اور خصوصیات اس کے سامنے روزِ روشن کی طرح بالکل مبرہن ہوں۔''

افتتاحی خطاب کے بعد ڈاکٹر اسرار احمد صاحب نے تنظیم اسلامی کی قراردادِ تاسیس پڑھ کر سنائی۔ یہ وہی قرارداد ہے جو ستمبر ۱۹۶۷ء میں رحیم یار خاں کے اجتماع میں منظور کی گئی تھی۔ اس قرارداد کو پڑھتے وقت جناب ڈاکٹر صاحب موصوف نے بعض مقامات کی تشریحات بھی بیان کیں۔

۲۷ مارچ ۱۹۷۵ء کی دو نشستوں میں تنظیمِ اسلامی کی قراردادِ تاسیس اور اس کی توضیحات

نیز تنظیم اسلامی کے اساسی معتقدات ونظریات اور شرائطِ شمولیت کی منظوری کے مراحل بحمد اللہ بحسن وخوبی طے ہو چکے تھے۔ ۲۸ مارچ کو جمعہ کی نماز کے بعد اس اساسی اجلاس کی تیسری نشست منعقد ہوئی‘ جس میں ۳۷ حضرات نے شرکت فرمائی۔ اس نشست کی کارروائی کا آغاز ڈاکٹر صاحب نے خطبۂ مسنونہ کے ساتھ کیا اور فرمایا:

’’تنظیم اسلامی کی رفاقت کے لیے جو شرائط ہم نے طے کی ہیں‘ اُن کے متعلق ایک اُصولی بات اچھی طرح جان لیجیے کہ یہ شرائط ہماری مقرر کردہ نہیں ہیں بلکہ ہمارے ایمان باللہ‘ ایمان بالرسالت اور ایمان بالآخرت کے لوازم اور مقتضیات میں سے ہیں۔ یہ وہ تقاضے اور مطالبے ہیں جو ہم سے ہمارا دین کرتا ہے۔ تجدید واحیائے دین کی جدوجہد اور نجاتِ اُخروی کے لیے اِن شرائط کو پورا کرنا ناگزیر ہے۔ ہمارے دَور میں جو فتنے موجود ہیں‘ اُن سے محفوظ رہنے کی ہر ممکن احتیاط ہم نے اپنے اساسی نظریات میں ملحوظ رکھی ہے۔ اِس دَور کا اصل فتنہ زر پرستی ہے۔ اس فتنہ سے بچنے کی ہم اگر کوشش نہ کریں یا اس میں ڈھیل رکھیں تو پھر کسی نئی تنظیم اور جماعت کی قطعی ضرورت نہیں ہے۔ ایسی بہت سی تنظیمیں اور جماعتیں ملک میں پہلے سے موجود ہیں۔ یہاں اِس وقت جو خلا ہے وہ ایک ایسی تنظیم وجماعت کا فقدان ہے جس کے رُفقاء میں یہ عزم وحوصلہ ہو کہ چاہے ان کا کاروبار تباہ ہو جائے‘ اُن کی اعلیٰ ملازمت چھوٹ جائے‘ اُن پر فقر وفاقہ کی نوبت آ جائے لیکن وہ ان سب کے باوجود ایثار وقربانی اور توکل علی اللہ کا رویہ اختیار کریں گے۔ دین کے احکام کو اپنے اُوپر لازمی نافذ کریں گے۔ اپنی انفرادی و ذاتی اصلاح کے ساتھ وہ دعوت وتبلیغ اور اقامت واظہارِ دین کے فریضہ کی انجام دہی میں لگ جائیں گے۔ اِسی میں ہماری دُنیوی واُخروی فلاح وکامرانی ہے۔

لہٰذا جو بھی اس تنظیم میں داخل ہونے کا فیصلہ کرے‘ اپنے ربّ کے اس مطالبہ کو سامنے رکھ کر کرے کہ: یٰٓاَیُّہَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوا ادۡخُلُوۡا فِی السِّلۡمِ کَآفَّۃً ۪

یہ بات ذہن میں رہے کہ یہ کوئی عام انجمن یا ادارہ نہیں ہے جو ہم بنا رہے

ہیں۔ جس نوع کی تنظیم ہم بنا رہے ہیں‘ اس طرح کی تنظیمیں بہت دیر کے بعد بنا کرتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ توفیق دے‘ ہمت دے‘ استقامت دے اور ہم اس کام کو لے کر آگے چل سکیں تو اس طرح کے کام جو آغاز میں بڑے چھوٹے نظر آتے ہیں‘ بسا اوقات تاریخ ساز بھی ثابت ہوتے ہیں۔ لہٰذا ہمیں اس وقت اپنے غور وفکر کی سطح کو اس مقام پر رکھنا چاہیے کہ اس کام کی عظمت ہی کی نسبت سے ہم پر ذمہ داریاں اور فرائض عائد ہوتے ہیں اور اسی مناسبت سے سعی وکوشش اور ایثار وقربانی کے لیے ہمیں خود کو تیار کرنا ہے۔ بسا اوقات تنظیمیں صرف ایک ذہنی سہارا بھی بن جاتی ہیں۔ خود حضور ﷺ نے تنبیہہ فرمائی کہ: ’’اے اہلِ قرآن! قرآن کو صرف ایک تکیہ اور سہارا نہ بنا لینا‘‘ لہٰذا اس تنظیم کو ہم نے ایک ذہنی سہارا نہیں بنانا ہے بلکہ ارادہ یہ ہے کہ اسے ایک فعال دینی انقلابی تحریک بنانا ہے۔

ہمیں اس پہلو سے اللہ تعالیٰ کا انتہائی شکر ادا کرنا چاہیے اور خود کو بہت خوش نصیب سمجھنا چاہیے کہ مختلف واسطوں اور ذریعوں سے ہمیں اپنے مسلمان ہونے کا اور اس مسلمان ہونے کی ذمہ داریوں کا شعور حاصل ہوا۔ اِس میں بھی ہمارے اکتساب کو اور ہماری کوشش کو دخل نہیں ہے۔ یہ جو کچھ ہوا ہے‘ اللہ تعالیٰ ہی کی طرف سے ہوا ہے۔

مَیں خود جب اپنے ماضی پر غور کرتا ہوں کہ میرا اسلامی جمعیت طلبہ اور جماعت اسلامی سے وابستہ ہو جانا محض اتفاقی امر نہیں۔ اس میں آخر کتنا دخل ہو گا میرے ارادے کو اور کتنا دخل ہو گا اللہ تعالیٰ کے فیصلے کو! اسی طرح بچپن میں علامہ اقبال کی اسلامی شاعری سے متاثر ہونا اور دل میں اسلام کی ’’نشأۃِ ثانیہ‘‘ کے جذبہ کا پرورش پانا بھی اتفاقی نہیں ہو سکتا۔ اس میں اللہ کی حکمت اور اُس کا فیصلہ ہی مؤثر حقیقی ہے۔ یہ سب کچھ اللہ ہی کے فیصلوں کے مطابق ہوتا ہے۔ یہ بات مَیں نے مثالاً عرض کی ہے۔ اگر ہم میں سے ہر شخص اپنے ماضی کا جائزہ لے کر غور

کرے کہ اس راہِ حق کی راہ یابی میں اُس کے ارادہ اور کوشش کا کتنا دخل ہے اور اللہ تعالیٰ کے فیصلوں کا کتنا دخل ہے‘ تو وہ میرے اس کہنے کا مطلب پالے گا۔

لہٰذا اس دعوت کے ساتھ ہمیں تعارف کا جو موقع ملا ہے تو یہ اللہ کا فضل اور اُس کا عطیہ ہے۔ اب اس فضل‘ نعمت اور توفیق کی بڑی ناقدری ہوگی اگر کسی چھوٹے سے بندھن اور حقیر سی دُنیوی رکاوٹ کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کے اتنے بڑے احسان اور انعام سے خود کو محروم رکھیں۔ یہ چھوٹے چھوٹے بندھن اور موانع بسا اوقات انسان کو پہاڑ معلوم ہونے لگتے ہیں۔ حضرت مسیح علیہ السلام کے وہ الفاظ جو انہوں نے اپنے حواریین و انصار سے مخاطب ہو کر فرمائے تھے‘ ہماری رہنمائی کر سکتے ہیں کہ: ’’کیوں خوف کرتے ہو کہ کیا کھاؤ گے اور کیا پیو گے؟ جنگل کی چڑیوں کو نہیں دیکھتے کہ وہ نہ کھیت بوتی ہیں‘ نہ کاٹتی ہیں‘ نہ کھتوں میں بھرتی ہیں۔ پھر بھی وہ جب صبح کو نکلتی ہیں تو شام کو سیر ہو کر اپنے گھونسلوں میں واپس آتی ہیں۔ اور تم کیوں فکر کرتے ہو کہ کیا پہنو گے؟ جنگل کی سوسن کو نہیں دیکھتے کہ وہ نہ بوتی ہے‘ نہ کاتتی ہے‘ نہ سیتی ہے‘ نہ پروتی ہے۔ پھر بھی مَیں تم سے سچ کہتا ہوں کہ جیسا خوش نما لباس اللہ نے اُس کو عطا کیا ہے‘ سلیمانؑ بھی اپنی ساری شان و شوکت کے باوجود اس طرح ملبوس نہ تھا۔ تو جو اللہ جنگل کی چڑیوں کو کھلاتا اور پلاتا ہے اور جو اللہ جنگل کی گھاس کے لیے‘ جو آج ہے کل آگ میں جھونک دی جائے گی‘ اس کی نشوونما کا سامان فراہم کر رہا ہے‘ تو کیا وہ تم ہی کو بے آسرا اور بے سہارا چھوڑ دے گا!‘‘

رفیقو! جس مہتم بالشان کام کے لیے ہم ایک تنظیم بنا رہے ہیں‘ اس کے لیے اتنی تعداد میں لوگوں کا رجوع ہونا میرے حاشیۂ خیال میں بھی نہیں تھا۔ ہنگامی مجنونوں کی مجھے ضرورت نہیں ہے۔ میرا خطاب تو اُن سے ہے جو ایک عرصہ سے مجھ سے واقف ہیں۔ ایک دعوت ان کے سامنے مختلف اسالیب اور پیراؤں سے آئی ہے‘ مدلّل ہو کر آئی ہے۔ وہ لوگ سمجھتے ہیں کہ یہ دعوت ہے کیا! باقی رہ گیا یہ کہ

ایک زوردار تقریر کی جائے‘ جذبات کو انگیخت کیا جائے اور اسلام کے لیے سرفروشوں کا ایک جلوس نکلوا دیا جائے تو ایسے کام ہرگز پیشِ نظر نہیں ہیں اور نہ ہوں گے۔ اسی طرح کے جذبات جس تیزی کے ساتھ ابھرتے ہیں‘ اتنی ہی تیزی کے ساتھ بیٹھ بھی جاتے ہیں۔ ان کا حال جھاگ کے مانند ہوتا ہے جس میں کوئی پائیداری اور استقامت نہیں۔ چنانچہ نئے حضرات جن کو ابھی انشراحِ صدر حاصل نہ ہوا ہو‘ توقف کریں۔ سوچیں‘ غور و فکر کریں اور جب مطمئن ہو جائیں تو ایک عزمِ مصمّم کے ساتھ پیش قدمی کریں۔ چند دن کی تاخیر سے کوئی حرج واقع نہیں ہوگا۔ یہ بھی جناب مسیح علیہ السلام ہی کے الفاظ ہیں کہ: ’’کتنے ہی وہ ہیں جو بعد میں آئیں گے لیکن پہلے آنے والوں سے آگے نکل جائیں گے۔‘‘ یہ بات جس شدّت کے ساتھ مَیں نئے لوگوں سے کہتا ہوں اسی شدّت کے ساتھ میں اپنے پرانے دوستوں سے کہتا ہوں کہ وہ توقف نہ کریں۔ اس لیے کہ میرے نزدیک ان کے لیے یہ توقف شیطان کا سب سے بڑا ہتھیار ہو سکتا ہے۔ اگر انہیں اس وقت شیطان نے التواء اور توقف کے چکر میں ڈال دیا تو اس چکر سے نکلنا ان کے لیے آسان نہیں ہوگا۔ یہ مراحل زندگی میں روز روز نہیں آیا کرتے۔ جن پر بات واضح ہو اور جن کو مجھ پر اعتماد بھی ہو‘ ان کو ہرگز توقف نہیں کرنا چاہیے۔

رفیقو! یہ خیال کرنا کہ فلاں پابندی چونکہ نہ قرآن نے لگائی نہ حدیث نے لگائی تو ہم وہ پابندی کیسے لگائیں‘ ایک بنیادی بات کو اچھی طرح نہ سمجھ لینے سے پیدا ہوتا ہے۔ وہ بنیادی بات یہ ہے کہ نبی اکرم ﷺ کا معاملہ یہ تھا کہ خود اپنی ذاتِ گرامی کے لحاظ سے ’’الجماعۃ‘‘ تھے‘ اور جو بھی مسلمان تھا وہ آپؐ سے متعلق تھا۔ لہٰذا حضور ﷺ نے پابندیاں وہی عائد فرمائیں جو فرائض دینی کا مقام رکھتی تھیں۔ باقی حضور ﷺ نے اپنے اُسوۂ حسنہ اور تعلیم و تلقین سے ایثار و قربانی کا جذبہ پیدا فرمایا۔ ہمارا معاملہ یہ ہے کہ جہاں تک اسلامی جماعت یعنی الجماعۃ کا تعلق ہے تو وہ مقام بحیثیت مجموعی اُمّتِ مُسلمہ کو حاصل ہے۔ اس اُمّت

مسلمہ میں سے ہم ایک جماعت بنا رہے ہیں اور اس ارشادِ ربانی کی تعمیل کر رہے ہیں کہ: وَلۡتَكُنۡ مِّنۡكُمۡ اُمَّةٌ يَّدۡعُوۡنَ اِلَى الۡخَيۡرِ وَيَاۡمُرُوۡنَ بِالۡمَعۡرُوۡفِ وَيَنۡهَوۡنَ عَنِ الۡمُنۡكَرِ۔ لہٰذا اس الجماعۃ میں سے ایک چھوٹی سی جماعت دعوت الی الخیر کے لیے بن رہی ہے' چونکہ اُمت بحیثیت مجموعی اپنا یہ فرض بھول چکی ہے۔ اس جماعت کو اعلائے کلمۃ اللہ کے لیے جدوجُہد کرنی ہے' ایثار کرنا ہے' قربانی دینی ہے۔ ایسی جماعت کو اس کام کی انجام دہی کے لیے چند اضافی پابندیاں لگانی پڑیں گی۔ مثال کے طور پر رفقاء کے لیے یہ پابندی لگائی گئی ہے کہ وہ ہفتہ واری اجتماعات میں لازماً شرکت کریں اِلاّ آنکہ ان کو کوئی عذرِ شرعی لاحق ہو۔ یہ اضافی پابندی اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی جانب سے عائد شدہ نہیں ہے۔ اسی پر عشر کی حد تک اعانت کے معاملہ کو قیاس کر لیجیے۔ ایسی پابندیاں دراصل تنظیم کے نظم اور ڈسپلن سے تعلق رکھتی ہیں جنہیں ہم اپنی رضا اور مرضی سے عائد کرتے اور قبول کرتے ہیں۔ پھر چونکہ اس تنظیم میں شامل ہونا کسی بھی مسلمان کے لیے اس کے مسلمان ہونے کی شرطِ لازم نہیں ہے' لہٰذا جو لوگ شعوری طور پر اس نظم کو قبول کریں ان کے لیے ہم اضافی پابندیاں لگا سکتے ہیں۔ اسی میں کوئی شرعی قباحت نہیں ہے۔''

نمازِ مغرب کے بعد ڈاکٹر صاحب سمیت کل ۶۱ حضرات نے تاسیسی اجلاس کی آخری نشست میں شرکت کی۔ ایک صاحب نمازِ مغرب سے قبل عہدِ رفاقت قبول کر کے سکھر روانگی کے لیے تشریف لے جا چکے تھے۔ گویا ''تنظیم اسلامی'' کا قافلہ اس موقع پر ۶۲ رفقاء کی شمولیت سے ترتیب پایا۔ اَللّٰھُمَّ زِدْ فَزِدْ! تمام شرکاء کے چہروں پر پُروقار سنجیدگی اور عزمِ مصمم کی کیفیت طاری تھی۔ ان میں تاجر بھی تھے' ملازمت پیشہ بھی' پروفیسرز بھی' طلبہ بھی' ڈاکٹرز بھی' انجینئرز بھی اور عام پڑھے لکھے افراد بھی۔ غرضیکہ ہر walk of life کے لوگ شامل تھے۔ ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کے چہرے پر فرض کی ذمہ داری کے احساس کے ساتھ متانت اور مسرت کے ملے جلے جذبات ہویدا تھے۔ آواز میں خفیف سا ارتعاش تھا۔ ظاہری کیفیت سے معلوم ہوتا تھا کہ ان

کے دل میں جذبات کا سمندر کروٹیں لے رہا ہے' لیکن ان کے اسلوبِ بیان میں ٹھہراؤ تھا۔ وہ انتہائی دھیمے مگر پُرتاثیر لہجے میں رفقاء سے یوں مخاطب ہوئے:

''اَلۡحَمۡدُ لِلّٰهِ الَّذِىۡ هَدٰٮنَا لِهٰذَا وَمَا كُنَّا لِنَهۡتَدِىَ لَوۡلَاۤ اَنۡ هَدٰٮنَا اللّٰهُ

رفیقو! سارا شکر' ساری تعریف' سارا سپاس اس اللہ ہی کو سزاوار ہے کہ جس نے راہِ حق کی طرف ہماری راہنمائی فرمائی اور ہم ہرگز راہ یاب نہ ہوتے اگر وہی اپنے کرم سے ہماری دست گیری نہ فرماتا۔ مجھے ہرگز توقع نہ تھی کہ مجھ جیسی شخصیت کی خشک دعوت' اور جھڑکنے اور جھٹکنے والے انداز کے باوجود اللہ کے اتنے مخلص بندے ''تنظیم اسلامی'' کی رفاقت کے لیے جمع ہو جائیں گے۔ اس دعوت اِلی اللہ سے واقف ہونے سے قبل ہم میں سے اکثر کی دوسروں سے شناسائی نہیں تھی۔ ہم ایک دوسرے سے واقف بھی نہیں تھے۔ ہماری دوستیاں اور قرابت داریاں بھی نہیں تھیں۔ ہم جمع ہوئے ہیں تو دعوت الی اللہ پر' کوئی دُنیوی غرض ہمارے پیش نظر نہیں۔ کسی قسم کی سیاست بازی ہمیں مطلوب نہیں۔ دینی' سیاسی' اور سماجی جماعتوں کی طرح ہماری اس تنظیم میں نہ عہدے ہیں نہ ووٹ ہیں۔ نہ مجلسِ شوریٰ کی رکنیت کے مواقع ہیں نہ مجلس انتظامیہ کے۔ نہ شہرت کے حصول کا کوئی موقع ہے نہ وجاہت کا۔ ہم خالصتاً للہ اور فی اللہ جمع ہوئے ہیں۔ اللہ ہی کے لیے ہمارا جڑنا ہے اور جس سے بھی ہم آئندہ جڑیں گے' اللہ ہی کے لیے جڑیں گے۔ جس سے ہم اس وقت کٹ رہے ہیں' اللہ ہی کے لیے کٹ رہے ہیں اور آئندہ جس سے کٹیں گے' اللہ ہی کے لیے کٹیں گے۔ جو کچھ ہم نے تنظیم کو مالی اعانت ادا کرنے کا ارادہ کیا ہے' وہ اللہ کے لیے کیا ہے اور جو کچھ کسی کو دیں گے' اللہ ہی کے لیے دیں گے۔ ہمارا مقصد صرف رضائے الٰہی ہے' اس کے سوا کچھ نہیں! میں خدا کو حاضر و ناظر جان کر اور اُسے گواہ بنا کر کہتا ہوں کہ اس دعوت اور تنظیم قائم کرنے میں فرض کی ادائیگی کی ذمہ داری اور رضائے الٰہی کے حصول کے سوا اور کوئی غرض میرے پیش نظر نہیں ہے۔ چنانچہ پورے احساسِ ذمہ داری

اور احساسِ مسئولیت کے ساتھ آپ سب کو گواہ بنا کر سب سے پہلے میں ’’تنظیم اسلامی‘‘ کا عہدِ رفاقت اُٹھاتا ہوں۔‘‘

اس وقت پورے اجتماع پر ایک گھمبیر خاموشی طاری تھی۔ تمام رفقاء کے چہرے تمتما رہے تھے اور آنکھوں میں آنسو مچل رہے تھے جن کو وہ ضبط کیے بیٹھے رہے۔ تعارف کی تکمیل کے بعد داعیِ عمومی نے ’’عہد نامہ رفاقتِ تنظیم اسلامی‘‘ کی ایک ایک شق کو پڑھنا شروع کیا اور تمام رفقاء اس کو دہراتے رہے۔ اس موقع پر اکثر رفقاء کی داڑھیاں آنسوؤں سے تر تھیں‘ اکثر کی ہچکیاں بندھی ہوئی تھیں اور یہ اللہ کے بندے رضائے الٰہی کے لیے دعوتِ تجدیدِ ایمان‘ توبہ اور تجدیدِ عہد کے قافلہ کے رفیق بن رہے تھے۔ وَمَا تَوْفِیْقِیْٓ اِلَّا بِاللّٰہِ الْعَلِیِّ الْعَظِیْمِ۔

اس کے بعد نہایت الحاح و زاری اور خشوع و خضوع کے ساتھ بارگاہِ ربّ العزت میں اجتماعی دعا کی گئی۔ عشاء کی نماز باجماعت ادا ہوئی اور اس طرح ’’تنظیم اسلامی‘‘ کے تاسیسی اجلاس کی کارروائی اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے اختتام پذیر ہوئی۔

وآخرُ دَعْوانا اَنِ الْحَمدُ لِلّٰہ رَبِّ العَالَمِین!

(مرتب: شیخ جمیل الرحمٰن)

❁❁❁

بقیہ: ضعفِ ارادہ

وہ معیارِ مطلوب کو کبھی فراموش نہیں کرتا‘ اس تک پہنچنے کی فکر سے کبھی غافل نہیں ہوتا۔ اس سے گری ہوئی ہر چیز پر سخت تشویش محسوس کرتا ہے‘ مگر کم سے کم قابلِ عمل معیار سے کام چلاتا رہتا ہے اور اس معیار سے گر جانے والے لوگوں کی وجہ سے اپنی اسکیم بدلنے کے بجائے انہیں ہٹا کر پھینک دینا زیادہ پسند کرتا ہے۔ اس کے لیے اپنی طاقت کا صحیح اندازہ لگانا اور اس کے مطابق کام کے پھیلاؤ اور اس کی رفتار میں کمی بیشی کرنا تو بے شک ضروری ہے۔ اس میں وہ غلطی کر جائے تو اپنے مقصد کو نقصان پہنچا دے۔

سخت نادان ہوگا وہ شخص جو اس چیز کا اندازہ لگانے میں پہلی اور دوسری قسم کے ذہنوں سے رہنمائی حاصل کرے۔ اس کے لیے اگر مددگار ہو سکتے ہیں تو تیسری قسم کے ذہن ہی ہو سکتے ہیں اور ان کی معرفت اسے حاصل ہونی چاہیے۔ ❁❁❁

ریاست اسرائیل: قریب الموت

مترجم: ڈاکٹر ساجد خاکوانی☆

(۱۰/اکتوبر ۲۰۲۳ء کو اسرائیل کے اخبار Haaretz میں ایک یہودی صحافی Ari Shavit کا مضمون "Israel is breathing its last breath" کے عنوان سے شائع ہوا ہے۔ ذیل میں اس کا ترجمہ ہدیۂ قارئین کیا جا رہا ہے۔)

معلوم ہوتا ہے کہ ہمارا واسطہ تاریخ کے مشکل ترین لوگوں سے پڑ گیا ہے اور فلسطینیوں کی زمین پر اُن ہی کا حق تسلیم کیے بغیر کوئی چارہ نہیں۔ میرا خیال ہے کہ ہم بند گلی میں داخل ہو چکے ہیں اور اب اسرائیل کے لیے ارضِ فلسطین پر قبضہ کا تسلسل‘ باہر سے آئے یہودیوں کی آبادکاری اور حصولِ امن ممکن نہیں رہا۔ اسی طرح صہیونیت میں تحریکِ تجدید‘ تحفظ جمہوریت اور مملکت میں آبادی کا پھیلاؤ بھی اب مزید نہیں چل پائیں گے۔ ان حالات میں اس ملک میں رہنے کی کوئی کشش باقی نہیں رہی۔ اب ہمیں وہی کرنا پڑے گا جو دو سال پہلے ’’روگیل الفار‘‘ نے کیا تھا۔ وہ یہ ملک چھوڑ کر باہر چلا گیا تھا۔ مملکت اسرائیل نے ہمیں پوری طرح قبول نہیں کیا کیونکہ ہر اسرائیلی یہودی کی جیب میں دوسرے کسی ملک کا پاسپورٹ بھی موجود ہے۔ اس کی وجہ کوئی مجبوری نہیں ہے بلکہ ہر اسرائیلی شہری نفسیاتی طور پر اسے ضروری سمجھتا ہے۔ ایسے میں سمجھ لینا چاہیے کہ کھیل اب ختم ہو چکا ہے۔ آپ کو چاہیے اپنے دوستوں کو خدا حافظ کہہ کر سان فرانسسکو‘ برلن یا پیرس کو سدھار جائیں۔ وہاں بیٹھ کر آپ آرام اور سکون سے اسرائیلی ریاست کو دم توڑتے دیکھ سکیں گے‘ جو آج اپنی آخری سانسیں لے رہی ہے۔ ہمیں ذرا فاصلے سے یہودی ریاست کے ڈوبنے کے مناظر دیکھنے ہوں گے‘ کیونکہ مسائل ابھی تک اپنے حل سے کوسوں دُور ہیں۔

☆ Email:drsajidkhakwani@gmail.com

شاید ابھی بھی ہم بند گلی سے نکل سکتے ہیں۔ ابھی بھی ارضِ فلسطین پر قبضہ ختم کیا جا سکتا ہے۔ ابھی بھی مواقع موجود ہیں کہ صہیونیت کی جدید تحریک میں اصلاحات ہو سکیں۔ ابھی بھی جمہوریت کو اس کی روح کے مطابق بحال کرنے کے امکانات موجود ہیں۔ ابھی بھی مملکت کی تقسیم ہو سکتی ہے۔ مَیں چاہتا ہوں کہ میں بن یامین نتن یاہو، لیب مین اور Neo-Nazis کو متوجہ کروں اور انہیں صہیونیت کی تباہی و بربادی کا مشاہدہ کراؤں۔ انہیں یہ باور کراؤں کہ ڈونلڈ ٹرمپ، کوشنر، بائڈن، بارک اوباما اور ہیلری کلنٹن ارضِ فلسطین پر یہ قبضہ کبھی ختم نہیں ہونے دیں گے۔ اقوامِ متحدہ اور یورپی یونین کے ادارے بھی غیر ملکی یہودیوں کی آبادکاری کبھی بھی نہیں روکیں گے۔ پوری دنیا میں اگر کوئی اسرائیلی سلطنت کو بچا سکتا ہے تو وہ خود اسرائیلی عوام ہیں۔ انہیں ایک نئے سیاسی معاہدے کے تحت بہرحال یہ تسلیم کرنا ہوگا کہ اس ارضِ فلسطین کے اصل مالک فلسطینی ہی ہیں اور یہ انہی کا وطن ہے۔ میں اپنے موقف کو ہی پُرزور طریقے پیش کروں گا۔ یہ نہایت اہم ہے اگر ہم یہاں زندہ رہنا چاہتے ہیں۔

اسرائیلی عوام جب سے فلسطین میں آباد ہوئے ہیں، تحریک صہیونیت انہیں تاریخی حوالے سے جھوٹ بول بول کر یہ دھوکا دیے چلی جا رہی ہے اور صہیونی کارندے ''ہولوکاسٹ'' کو غیر معمولی طور پر بڑھا چڑھا کر پیش کرنے کے بعد یہ جھوٹ کہتے چلے آ رہے ہیں کہ خداوند نے تم سے ارضِ فلسطین کا وعدہ کر رکھا ہے اور ہیکل سلیمانی بھی دراصل مسجد اقصیٰ کے نیچے موجود ہے۔ اس طرح ٹیکسز کی بھاری بھاری رقوم چوس کر بھیڑیے ایٹمی طاقت بن گئے۔ اب تو تل ابیب یونیورسٹی کے محققین اور بہت سے مغربی ماہرین آثارِ قدیمہ بھی کہہ چکے ہیں کہ ہیکل سلیمانی کا وجود ہزاروں سال پہلے ختم ہو چکا اور آج کہیں بھی اس کا کوئی نام و نشان موجود نہیں ہے۔ آخری دفعہ ۱۹۶۸ء میں British School of Archeology' یروشلم کی ڈائریکٹر نے بھی کھدائی کر کے ہیکل سلیمانی کے آثار تلاش کرنے کی کوشش کی تھی، لیکن کامیابی نہ ہوئی۔ اسرائیلی جسے ''ہیکل سلیمانی'' کہتے ہیں، اس طرح کی عمارت کے کئی نقشے کتابوں میں ملتے ہیں لیکن مسجد اقصیٰ کے نیچے ایسی کسی عمارت کا تصور ایک مفروضے کے سوا کچھ نہیں۔ اس سے قبل انیسویں صدی کے وسط میں ''کیتھلین کینون'' بھی فلسطین اسی لیے آئی تھی کہ عہد نامہ قدیم کی کتب کے مطابق اس مقام کی نشان دہی کی جا سکے جہاں یہ عمارت قائم کی گئی تھی۔

کیا اسرائیلیوں کے لیے یہ کسی لعنت سے کم ہے کہ مقدسیوں، خلیلیوں اور نابلسیوں سے روزانہ اپنے چہروں پر تھپیڑ کھائیں، جن کی شدت چھریوں اور چاقوؤں کے وار سے کسی طرح کم نہیں ہوتی۔ جفا، حیفہ اور ایسر جاتے ہوئے راستے میں پتھروں پر پتھر کھائیں! اب اسرائیلی جان چکے ہیں کہ فلسطین میں ان کا کوئی مستقبل نہیں۔ یہ کہنا بالکل غلط ہے کہ ارضِ فلسطین کا کوئی وارث نہیں۔ بائیں بازو کے ایک صہیونی دانشور اور مصنف ''گڈون لیوی'' نے بہت پہلے کہہ دیا تھا کہ یہودیوں کو نہ صرف فلسطینیوں کا حق تملیک ماننا پڑے گا بلکہ ارضِ فلسطین پر انہیں ترجیح دینا ہوگی کیونکہ ان کی فطرت باقی دنیا سے بہت مختلف ہے۔ ہم انہیں بدکار اور نشے میں مبتلا سمجھتے ہوئے ان کی زمینوں پر قابض ہیں اور چاہتے ہیں کہ وہ اپنے وطن کو فراموش کر دیں۔

وہ ۱۹۸۷ء سے حالت مزاحمت میں ہیں اور ہم انہیں قید خانوں میں بھرتے جا رہے ہیں۔ سالوں بعد ہم یہ سمجھے کہ شاید اب انہیں سبق سکھایا جا چکا ہے لیکن ۲۰۰۰ء میں اپنی زمینیں واگزار کرانے کے لیے وہ ایک بار پھر مسلح ہو کر ہمارے سامنے آ گئے۔ اس کے باوجود ہم نے ان کا محاصرہ جاری رکھا اور ان کے گھروں کو ملیامیٹ کرتے رہے۔ جب انہوں نے ہمارے اوپر میزائل داغنا شروع کر دیے تو ہم نے ان کے اور اپنے درمیان بلند و بالا دیواریں اور باڑھ لگانے کی منصوبہ بندی کرنی شروع کر دی۔ اس کے ردِ عمل میں انہوں نے سرنگیں کھودیں اور ہم پر زیرِ زمین حملہ آور ہوئے۔ اب حالیہ جنگ کے آغاز میں انہوں نے ہماری ریاست اسرائیل کے اندر گھس کر ہمیں قتل کرنا اور مارنا شروع کر دیا۔ ہم نے اپنی فکر اور سوچ کے مطابق ان سے لڑائی شروع کی لیکن انہوں نے ہمارے خلائی سیارہ ''آموس'' ہی کو جام کر دیا۔ وہ ہمیں مسلسل دھمکیوں پر دھمکیاں دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ان کے نوجوان اسرائیلی نشریاتی اداروں کو بھی جام کر دیں گے۔ ایسا لگتا ہے کہ ہمیں تاریخ کے مشکل ترین افراد سے پالا پڑ گیا ہے اور انہیں مانے بغیر اور سرزمین فلسطین پر اپنا قبضہ ختم کیے بغیر اس مسئلے کا کوئی حل موجود نہیں ہے!

❀❀❀

میثاق، حکمت قرآن اور ندائے خلافت کے انٹرنیٹ ایڈیشن
تنظیم اسلامی کی ویب سائٹ www.tanzeem.org پر ملاحظہ کیجیے۔

اسرائیل' پاکستان اور ذوالفقار علی بھٹو

رضی الدین سیّد

اسرائیل پر حماس کے کامیاب وحیران کن حملے اور اسرائیل کی انسانیت سوز حربی کارروائیوں کے بعد لازمی ٹھہرا ہے کہ ہم اس موقع پر پاکستان کے ایک سابق وزیر اعظم ذوالفقار علی بھٹو کے خیالات بھی جاننے کی کوشش کریں۔ یہ ایک تقریر ہے جو انہوں نے اسلامی سربراہ کانفرنس منعقدہ ۱۸ تا ۲۲ فروری ۱۹۷۴ء لاہور میں کی تھی۔ تقریر میں انہوں نے اسرائیل کی مخالفت اور فلسطینیوں کی حمایت میں پُرجوش دلائل دیے تھے۔ آج کے حالات میں ان کی اس تقریر کا دوبارہ مطالعہ خصوصی دلچسپی کا حامل ہوگا۔ ذوالفقار علی بھٹو کی یہ تقریر ''امپیکٹ انٹرنیشنل لندن'' نے اگست ۲۰۰۳ء کے شمارہ میں شائع کی تھی۔

''آج سے ۳۴ سال قبل اسی لاہور میں قائداعظم کی قیادت میں وہ عظیم قرارداد منظور کی گئی تھی' جس کے بعد برصغیر جنوبی ایشیا میں آزادی کی بھرپور تحریک شروع ہوسکی تھی۔ عجیب اتفاق ہے کہ آل انڈیا مسلم لیگ کے اسی اجلاس میں' جس میں آزادی کی یہ قرارداد منظور کی گئی' فلسطین کی آزادی کے بارے میں بھی ایک قرارداد اتفاقِ رائے سے منظور کی گئی تھی۔ اس قرارداد کے الفاظ تھے: ''سب کی سوچی سمجھی رائے ہے' اور ہم اسے بالکل دوٹوک الفاظ میں بتا دینا چاہتے ہیں' کہ فلسطین میں منتشر اور غیر جامع طور پر کوئی ایسے اقدامات نہیں اٹھانے چاہئیں جو اپنی لفظی تعبیر اور حقیقی مفہوم کے اعتبار سے عالمِ اسلام سے کیے گئے وعدوں کے کسی بھی طرح خلاف ہوں۔'' قرارداد میں مزید تنبیہ کی گئی تھی کہ ''عربوں کو جھکانے اور خوف زدہ کرنے کے لیے اس مقدس سرزمین پر کسی بھی طاقت کا استعمال نہیں کیا جانا چاہیے۔''

مسلم دنیا کے جائز مطالبات کے لیے پاکستان کی تائید بنیادی طور پر اس کی قومی ذمہ داری رہی ہے۔ جب تقسیم فلسطین کا فیصلہ کیا گیا' یہاں لاہور میں ایک احتجاجی مظاہرے کا اہتمام کیا گیا تھا جس میں علامہ اقبال جیسے عظیم اسلامی شاعر نے بھی بنفسِ

نفیس شرکت کی تھی۔ اس موقع پر علامہ اقبال نے واضح الفاظ میں مسئلہ فلسطین کی اہمیت کو اُجاگر کیا تھا۔ انہوں نے کہا تھا: ''یہ احتجاج محض فلسطین تک ہی محدود نہیں رہے گا بلکہ اس کے اثرات پوری مسلم دنیا پر بھی پڑیں گے۔''

بعد ازاں قیامِ پاکستان کے فوراً بعد اکتوبر ۱۹۴۷ء میں قائداعظم نے ایک بار پھر تنبیہ کرتے ہوئے کہا کہ ''مسئلہ فلسطین ایک بہت بڑے خطرے کا پیش خیمہ ہے' جس سے ناقابلِ تلافی تنازع جنم لے گا'' اور یہ کہ ''ساری مسلم دنیا اس کے خلاف بغاوت کر دے گی کیونکہ اسرائیل کا کوئی تاریخی' سیاسی اور اخلاقی پس منظر نہیں ہے۔'' اس کے فوراً بعد پاکستان نے اقوام متحدہ میں بیان دیا تھا کہ ''اس مقدس سرزمین کو صلیب پر لٹکایا جا رہا ہے۔''

آج سے پچاس سال پہلے مسئلہ فلسطین کا کوئی وجود نہ تھا۔ یہ صرف مغربی استعماریت ہی کا غرور تھا جس نے کسی دوسری قوم کے ایک حصے (یعنی یہودیوں) کو ایک تیسری قدیم قوم (یعنی عربوں) کا وطن چھین کر دینے کا وعدہ کیا تھا۔ یہی وہ بنیادی ناانصافی ہے جس نے ساری دنیا میں بے چینی کو جنم دیا ہے' یعنی کسی آباد قوم کو اپنے ہی وطن سے دھکیل کر وہاں ایک دوسری اجنبی قوم کو لا کر بسا دیا جائے۔ کسی چھوٹی سی درآمد شدہ اقلیت کو کسی اکثریت کے سر پر مسلط کر دینا صریحاً نوآبادیاتی طرزِ فکر کا نتیجہ ہے۔ اس کی وجہ ''مسلم یہود'' یا ''عرب یہود'' دشمنی نہیں ہے' کیونکہ بحیثیت مسلمان ہم دنیا کی کسی بھی قوم سے دشمنی نہیں رکھتے' اور جب ہم یہ دعویٰ کرتے ہیں تو یہودیوں کو اس سے خارج نہیں کرتے۔ بحیثیت یہودی ہمیں ان سے کوئی پُرخاش نہیں ہے لیکن بحیثیت صہیونی' ہم ان کے ساتھ دوستانہ تعلقات سے انکاری ہیں' کیونکہ اس حیثیت سے وہ ہم پر فوجی قوت اور ٹیکنالوجی کی برتری سے حملہ آور ہوتے ہیں۔

گزشتہ صدیوں میں یہودیوں کے ساتھ جو ظلم ہوا ہے اور نازی ازم (ہٹلر) کے دور میں ان پر جو عظیم بربادی (ہولوکاسٹ) مسلط کی گئی تھی' وہ بے شک تاریخ کا ایک سیاہ باب ہے۔ البتہ اس کا حل یہ نہیں ہے کہ فلسطینیوں سے ان کا حق ہی چھین لیا جائے' بلکہ فی الاصل یہ مغرب کے اپنے ذمے ہے۔

مسئلہ فلسطین کو اقوام متحدہ میں اس دور میں لے جایا گیا جب یہ ادارہ تمام دنیا کی نمائندگی بمشکل کر پاتا تھا' حالانکہ مسلم دنیا نے اس وقت بھی اس مسئلے کی سنگینی سے آگاہ کیا

تھا۔ ان تمام یادداشتوں کو شروع ہی سے بے حیثیت بنا دیا گیا۔ ۱۹۶۷ء کے بعد اسرائیل مزید جارح ہو چکا ہے۔ اس نے اقوام متحدہ کی قرارداد کو بھی پسِ پشت ڈال دیا ہے۔ تاہم امید ہے کہ جنیوا میں کیے جانے والے معاہدے میں مشرقِ وسطیٰ سے متعلق تمام پہلوؤں کو مدِنظر رکھا جائے گا۔ ۱۹۶۷ء کے بعد مقبوضہ عرب علاقوں سے اسرائیلی دست برداری‘ یروشلم کے مقدس شہر کی مسلمانوں کو حوالگی‘ اور فلسطینی عوام کے حقوق کی بحالی جیسے اقدامات ایک منصفانہ معاہدے کی ناگزیر بنیادیں ہیں۔ یہ سارے نکات اقوام متحدہ کی قرارداد نمبر ۲۴۲ ہی کی وضاحتیں ہیں‘ بشرطیکہ اس کی تعبیر حقیقی طور پر کی جائے۔

دنیا کی کسی بھی ریاست کو یہ حق حاصل نہیں ہے کہ وہ کسی دوسرے ملک پر ناجائز قبضے کے بعد اپنی سرحدوں کو محفوظ کرنے کا حق طلب کرے۔ کسی ریاست کی سرحدوں کا تحفظ تب ہی ممکن ہے جبکہ وہ بین الاقوامی اصول وضوابط کے تحت ہوں۔ کسی قوم کی دفاعی حکمتِ عملی صرف اس کی تسلیم شدہ سرحدوں ہی سے تعلق رکھتی ہے‘ نہ کہ اس کے توسیع پسندانہ عزائم سے۔ پھر یہ سوال بھی نہایت اہمیت کا حامل ہے کہ فی الاصل کس قوم کا تحفظ مطلوب ہے؟ گزشتہ ۲۷ سالوں میں مسلط کی گئی جارحیت کی وجہ سے یہ عرب ہیں جن کی سرحدیں اسرائیل کے خلاف محفوظ ہونی چاہئیں‘ نہ کہ اسرائیل کی سرحدیں۔

اسرائیلی مقبوضہ علاقوں میں القدس کا شہر مسلمانوں کے لیے خصوصی اہمیت کا حامل ہے۔ حضرت ابراہیم‘ حضرت موسیٰ اور حضرت عیسیٰ ؑ کی مقدس روایتوں کے امین‘ اور اپنی رواداری کی دیرینہ حیثیت سے یروشلم ہمارے دلوں میں بستا ہے۔ صلیبی قبضوں کی مختصر مدت کو چھوڑ کر‘ یروشلم ہمیشہ سے‘ میں ایک بار پھر دہراتا ہوں کہ‘ ہمیشہ سے ایک مسلم شہر رہا ہے۔ ۶۳۷ء میں حضرت عمرؓ کے ہاتھوں یروشلم کی فتح کے بعد سے مسلمان ہر مذہب کے ماننے والوں کے لیے ایک امین کی حیثیت سے اپنے فرائض انجام دے رہے ہیں۔ آج بھی صرف مسلمانوں ہی کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ اس شہر کے غیر جانبدار محافظ بنے رہنے کی حیثیت حاصل کریں‘ کیونکہ صرف وہی ہیں جو یروشلم کی بنیادوں میں پیوستہ تینوں پیغمبرانہ روایات پر ایمان رکھتے ہیں۔

یہ ہم نہیں بلکہ یہودی ہیں جنہوں نے مسلّمہ اصولوں کے خلاف اپنی سرحدیں متعین کی ہیں۔ اسرائیل اپنی غیر قانونی حرکتوں کو جائز ثابت کرنے کے لیے مذہبی اور ثقافتی

حوالے دیتا رہتا ہے۔ اس امر کا قدرتی نتیجہ یہ ہوگا کہ خطے میں ایک مذہبی جنگ برپا ہو جائے گی۔ اگر مذہب سے ہٹ کر دیکھا جائے تب بھی یروشلم کی حیثیت کا تعین وہاں کے شہریوں کی اصلیت کو نظرانداز کر کے نہیں کیا جا سکتا۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ اس کے باشندوں کی اکثریت عرب تھی جنہیں ۱۹۴۸ء میں مغربی کنارے سے جارحانہ طور پر بے دخل کیا گیا۔ شہر سے یہودیوں کے مذہبی تعلق کا مطلب یہ ہرگز نہیں ہو سکتا کہ وہ اس شہر کی زمین پر غاصبانہ قبضہ کر لیں!

مجھے اس پلیٹ فارم سے یہ کہنے کی اجازت دی جائے کہ کوئی معاہدہ‘ دستاویز‘ مفاہمت جو اس مقدس شہر پر اسرائیلی قبضے کو مستحکم کرنے میں مددگار ثابت ہو‘ یا یہ کہ وہ اس مقدس شہر کا انتظام کسی غیر عرب یا غیر مسلم کے حوالے کرنے میں معاون ہو‘ اس کی وقعت فقط اتنی ہی ہوگی جتنی کہ وہ سادہ سا کاغذ جس پر یہ دستاویز لکھی گئی ہے۔ یہ کوئی دھمکی نہیں ہے‘ لیکن اس تنبیہہ پر کان نہ دھرنے کا مطلب یہ ہوگا کہ ہم ایک ایسے فریب کی حوصلہ افزائی کر رہے ہیں جس کے باعث مشرقِ وسطیٰ میں پائیدار امن کا خواب کبھی شرمندۂ تعبیر نہیں ہو سکے گا۔ یہ ایک ایسی آگ سلگ رہی ہے جسے بجھانے کے لیے کوئی حیلہ سازی یا ماہرانہ چال مددگار ثابت نہیں ہو سکے گی!

عالمی قوتوں پر خصوصاً وہ جنہوں نے ۱۹۴۷ء میں فلسطین کی تقسیم کا انتظام کیا تھا‘ بھاری فرائض عائد ہوتے ہیں۔ ان پر لازم ہے کہ وہ فلسطینیوں کے ساتھ کی گئی ناانصافیوں کا مداوا کریں۔ اس سے بڑا ظلم اور کیا ہوگا کہ کسی قوم کو اس کے وطن سے دھکیل دیا جائے اور اسے ایک منتشر اور تکلیف دہ حالت میں رہنے پر مجبور کیا جائے؟ پھر یہ کہ ایسا سب کچھ ماضی کی سامراجیت میں نہیں بلکہ اس جمہوری دور میں ہوا جب ہر طرف ناانصافی کے خلاف آواز اٹھ رہی ہے۔ جب فلسطینی یہ دیکھتے ہیں کہ ان کے وطن میں دنیا بھر سے یہودیوں کو بسنے کی دعوت دی جا رہی ہے تو ان کے غم و غصے کا اندازہ کوئی نہیں سکتا۔

آج کے دن اسلامی کانفرنس کے منشور پر ایمان رکھنے والے تمام اسلامی ممالک اس امر کے پابند ہیں کہ وہ فلسطینی عوام کے جائز حقوق کے لیے جدوجہد کریں۔ نہ صرف فلسطینی عوام کی خاطر‘ نہ صرف اسلامی برادری کی خاطر‘ بلکہ عالمی امن کے عظیم مقاصد کی خاطر بھی!‘‘

بیت المقدس کا مختصر تاریخی خاکہ

سعد عبداللہ ☆

مسجدِ اقصیٰ: قبلہ اوّل؟

مسجدِ اقصیٰ کو عام طور پر قبلۂ اوّل کہہ دیا جاتا ہے جب کہ واقعہ یہ ہے کہ قبلۂ اوّل مسجدِ حرام ہے اور قیامت تک یہی قبلہ رہے گا۔ سولہ ماہ کے لیے مسلمانوں کی آزمائش کے لیے بیت المقدس کو قبلہ مقرر کیا گیا تھا جسے بعد میں تحویل قبلہ کے حکم کے ذریعے تا قیامِ قیامت بدل دیا گیا۔

﴿وَمِنْ حَيْثُ خَرَجْتَ فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ۖ وَإِنَّهُ لَلْحَقُّ مِنْ رَبِّكَ ۗ وَمَا اللَّهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُونَ ﴿١٤٩﴾﴾ (البقرة)

''اور جہاں کہیں سے بھی آپؐ نکلیں تو (نماز کے وقت) آپ اپنا رُخ پھیر لیجیے مسجد حرام کی طرف۔ اور یقیناً یہ حق ہے آپؐ کے ربّ کی طرف سے۔ اور اللہ غافل نہیں ہے اس سے جو تم کر رہے ہو۔''

﴿إِنَّ أَوَّلَ بَيْتٍ وُضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِي بِبَكَّةَ﴾ (آلِ عمران:۹۶)

''یقیناً پہلا گھر جو لوگوں کے لیے بنایا گیا (اللہ کی عبادت کے لیے) وہی ہے جو مکہ میں ہے۔''

حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: میں نے پوچھا: اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم! سب سے پہلی مسجد کون سی تعمیر کی گئی؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''مسجدِ حرام''۔ میں نے پوچھا: اس کے بعد؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''مسجدِ اقصیٰ۔'' (بخاری)

اکثر اہلِ علم کی رائے کے مطابق یہ دونوں مساجد ابتدا میں حضرت آدم علیہ السلام نے تعمیر فرمائیں۔

ارشادِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے: ''اللہ تعالیٰ نے حضرت جبرئیل علیہ السلام کو حضرت آدم علیہ السلام اور بی بی حواؑ کی طرف بھیجا۔ پھر ان دونوں سے کہا کہ میرے لیے ایک عمارت بناؤ اور جبرئیلؑ نے ان کے لیے عمارت کی حدود کا نقش قائم کر دیا۔ حضرت آدم علیہ السلام بنیادیں کھودنے لگے اور اماں حواؑ مٹی ہٹاتی

☆ شعبہ اکیڈمکس، قرآن انسٹیٹیوٹ، لطیف آباد، کراچی

رہیں یہاں تک کہ پانی نکل آیا۔ پکارا گیا: اے آدمؑ! رک جاؤ۔ پھر جب ان دونوں نے عمارت مکمل کر لی تو اللہ تعالیٰ نے انہیں طواف کرنے کا حکم دیا اور ان سے کہا گیا کہ آپ پہلے انسان ہیں اور یہ پہلا گھر ہے (جو کہ لوگوں کی عبادت کے لیے بنایا گیا ہے)۔ پھر کئی نسلیں گزر گئیں تو حضرت نوح علیہ السلام نے اس گھر کا حج کیا۔ پھر کئی نسلیں گزر گئیں تو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اس کی بنیادوں کو دوبارہ اٹھایا۔'' (دلائل النبوۃ للبیہقی)

حضرت ابراہیم علیہ السلام کا زمانہ

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے بیت اللہ اور بیت المقدس کو دعوتِ توحید کا مرکز بنایا۔ جب حضرت ابراہیم علیہ السلام کی قوم ان کی جان کی دشمن ہوئی تو اللہ تعالیٰ نے آپؑ کو بیت المقدس کی طرف ہجرت کروائی۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿وَنَجَّيْنَاهُ وَلُوطًا إِلَى الْأَرْضِ الَّتِي بَارَكْنَا فِيهَا لِلْعَالَمِينَ ﴿٧١﴾﴾ (الانبیاء)

''اور ہم ابراہیمؑ کو اور لوطؑ کو بچا کر اُس سرزمین کی طرف نکال لے گئے جس میں ہم نے برکتیں رکھی ہیں سب جہان والوں کے لیے۔''

ہجرت کے بعد حضرت ابراہیم علیہ السلام نے دعوتِ توحید کا ایک مرکز اِس سرزمین فلسطین کو بنایا۔ آپ کے چھوٹے بیٹے حضرت اسحاق علیہ السلام اور پوتے حضرت یعقوب علیہ السلام کا مسکن بھی یہی مقدس سرزمین تھی۔ بعد میں بنی اسرائیل حضرت یوسف علیہ السلام کے مصر میں اقتدار و تمکن اور مصر بلائے جانے پر وہاں منتقل ہو گئے۔ کچھ عرصے بعد قبطی قوم نے بغاوت کر کے بنی اسرائیل کو اپنا غلام بنا لیا جس سے نجات دلانے کے لیے اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو مبعوث فرمایا۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کا زمانہ

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے دور ہی میں اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کو خوش خبری دی کہ اگر وہ بیت المقدس میں آباد عمالقہ نامی قوم کے خلاف قتال کریں تو اللہ تعالیٰ ان کو فتح دے گا۔ ارشاد ہوتا ہے:

﴿يَا قَوْمِ ادْخُلُوا الْأَرْضَ الْمُقَدَّسَةَ الَّتِي كَتَبَ اللَّهُ لَكُمْ وَلَا تَرْتَدُّوا عَلَىٰ أَدْبَارِكُمْ فَتَنْقَلِبُوا خَاسِرِينَ ﴿٢١﴾﴾ (المائدة)

''(تو) اے میری قوم کے لوگو! اب داخل ہو جاؤ اس ارضِ مقدس (فلسطین) میں جو اللہ نے تمہارے لیے لکھ دی ہے اور اپنی پیٹھوں کے بل واپس نہ پھرنا (اگر ایسا کرو

گے) تو ناکام و نامراد پلٹو گے۔''

قوم نے اس موقع سے فائدہ نہ اٹھایا اور قتال کرنے سے صاف انکار کر دیا۔ اس کے نتیجے میں بنی اسرائیل پر بیت المقدس کی سرزمین چالیس سال کے لیے حرام کر دی گئی۔

چالیس سال تک صحرا میں بھٹکنے کے دوران ایک نئی نسل پل کر جوان ہوئی۔ اس نسل پر فرعون کی غلامی کے اثرات نہیں تھے۔ صحرا میں پرورش پانے والی اس نسل نے اس وقت کے نبی حضرت یوشع علیہ السلام بن نون کی قیادت میں جہاد کیا اور ارضِ مقدس (فلسطین) پر فتح حاصل کی۔ یہ فتح عارضی ثابت ہوئی اور کچھ ہی عرصہ بعد محکوم قوم یعنی عمالقہ دوبارہ غالب آ گئی۔ اس نے اسرائیلیوں کو ارضِ مقدس سے نکال باہر کیا۔

حضرات طالوت' داؤد اور سلیمان علیہم السلام کا زمانہ

اس کے بعد جناب طالوت کی قیادت میں بنی اسرائیل دوبارہ منظم ہوئے اور ۱۰۲۰ ق م میں انہوں نے ارضِ مقدس پر فتح حاصل کر کے مستحکم حکومت قائم کی۔ بیس سال جناب طالوت خلیفہ رہے' پھر چالیس سال حضرت داؤد علیہ السلام کی خلافت رہی اور اس کے بعد چالیس سال حضرت سلیمان علیہ السلام خلیفہ رہے۔ حضرت سلیمان علیہ السلام نے ارضِ مقدس میں ایک مسجد بنائی جسے ہیکلِ سلیمانی کہا جاتا ہے۔

بنی اسرائیل کا پہلا دورِ زوال

حضرت سلیمان علیہ السلام کے بعد بنی اسرائیل میں خانہ جنگی شروع ہوگئی اور ان کی ریاست دو حصوں میں تقسیم ہوگئی۔ شمالی ریاست اسرائیل کہلائی' جسے ۷۰۰ ق م میں آشوریوں نے تباہ کر دیا۔ جنوبی ریاست یہودا کہلائی' جس پر ۵۸۷ ق م میں بابل کے حکمران بختِ نصر نے حملہ کیا۔ بختِ نصر نے بیت المقدس شہر کی اینٹ سے اینٹ بجادی' تمام مال ومتاع اور ہیکل کی تمام اشیاء کو لوٹ لیا' ہزارہا انسانوں کو قتل کیا اور ایک لاکھ سے زائد کو قیدی بنا کر بابل لے گیا۔

حضرت عزیر علیہ السلام کا زمانہ

حضرت عزیر علیہ السلام جو اُس وقت کے نبی تھے' شہر سے باہر تھے۔ انہوں نے واپس آ کر اجڑے ہوئے شہر کو دیکھا تو حیران ہوئے کہ جس شہر کے بارے میں مستقبل کی پیشین گوئیاں ان

کے علم میں ہیں' یہ شہر دوبارہ کیسے آباد ہوگا! اللہ تعالیٰ نے حضرت عزیر علیہ السلام کو ۱۰۰ سال سُلا کر اٹھایا اور بعث بعد الموت کا تجربہ کرایا۔ دوسری طرف ایران کے بادشاہ ذوالقرنین نے بابل پر حملہ کر کے اسرائیلیوں کو آزاد کرا دیا۔ اب ان کے قافلے دوبارہ بیت المقدس آنا شروع ہوئے اور حضرت عزیر علیہ السلام کی تجدیدی مساعی کے ذریعے اسرائیلیوں میں پھر سے ایمان ویقین کی شمعیں روشن ہوئیں اور ان کی سیرت وکردار کی اصلاح ہوئی۔ کچھ عرصہ یونانیوں کے ساتھ اسرائیلیوں کی معرکہ آرائی ہوئی اور آخر کار وہ ۱۷۵ ق م میں دوبارہ ایک عظیم سلطنت قائم کرنے میں کامیاب ہوئے' جس کا نام تھا: مکابی سلطنت۔ اب انہوں نے دوبارہ ہیکلِ سلیمانی کے نام سے ایک مسجد تعمیر کر لی۔

حضرت مریم اور حضرت عیسیٰ علیہما السلام کا زمانہ

حضرت مریمؑ کی پرورش اسی ہیکلِ سلیمانی میں ہوئی۔ پھر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی جائے پیدائش بھی یہی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ مقام عیسائیوں کے لیے بھی تقدس کا درجہ رکھتا ہے۔

بنی اسرائیل کا دوسرا دورِ زوال

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی جب بعثت ہوئی تو یہودیوں نے ان پر ولد الزنا اور مرتد ہونے کے الزامات لگائے۔ یہودیوں کو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے انکار اور ان پر بہتان طرازی کی سزا اس طرح ملی کہ رومی جرنل ٹائٹس نے ۷۰ء میں بیت المقدس پر حملہ کر کے ایک بار پھر ہیکل کو شہید کر دیا۔ ایک لاکھ تینتیس ہزار یہودیوں کو قتل کیا اور بقیہ کو بیت المقدس سے نکال کر شہرِ مقدس میں ان کے داخلہ پر پابندی لگا دی۔ یہ یہودیوں کا ''دورِ انتشار'' (Diaspora) کہلاتا ہے جس میں یہ دنیا کے مختلف حصوں میں پھیل جانے پر مجبور ہوگئے۔

رومی سلطنت کا عیسائیت قبول کرنا

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے تین سو سال بعد ۳۱۳ء میں رومن ایمپائر نے بحیثیتِ مجموعی عیسائی مذہب قبول کر لیا۔ انہوں نے بیت المقدس کے مشرقی حصے میں جہاں حضرت مریمؑ نے سکونت اختیار کی تھی' اپنی عبادت گاہیں تعمیر کر لیں۔

نبی آخر الزماں ﷺ کی بعثت

۶۱۰ء میں نبی آخر الزماں حضرت محمد ﷺ پر ظہورِ نبوت ہوا اور دس سال بعد یعنی ۶۲۰ء میں آپ ﷺ نے سفرِ معراج کے دوران مسجدِ حرام سے مسجدِ اقصیٰ تک سفر کیا۔ مسجدِ اقصیٰ میں آپ ﷺ نے تمام انبیاء و رسل ؊ کی ارواح سے ملاقات کی اور دو رکعت نماز میں ان کی امامت فرمائی۔ اس سارے عمل کی حکمت یہ حقیقت واضح کرنا تھی کہ مسجدِ حرام کے ساتھ ساتھ اب مسجدِ اقصیٰ کے متولی بھی نبی اکرم ﷺ اور آپؐ کے امتی ہیں۔

حضرت عمر فاروق ؓ کا زمانہ

نبی اکرم ﷺ کے وصال کے پانچ سال بعد ۶۳۷ء میں مسلمانوں نے حضرت عمر فاروق ؓ کے دورِ خلافت میں بیت المقدس فتح کر لیا۔ عیسائیوں نے پُرامن طور پر ایک معاہدے کے ذریعے شہر مسلمانوں کے حوالے کیا۔ معاہدہ کرتے وقت عیسائیوں نے مطالبہ کیا کہ یہودیوں کو اس شہر میں داخلے کی اجازت نہ دی جائے۔ حضرت عمر فاروق ؓ نے یہ مطالبہ تسلیم کرنے سے انکار کر دیا کہ ہمارا دین اس کی اجازت نہیں دیتا۔ البتہ معاہدہ میں یہ طے ہوا کہ یہودی اس علاقے میں آباد نہ ہو سکیں گے اور یہاں کوئی رہائش، صنعتی یا زرعی اراضی یا عمارت نہیں خرید سکیں گے۔ مسلمانوں کے تمام ادوارِ حکومت میں یہودیوں نے اس پابندی کو ختم کرانے کی کوشش کی اور بعض مواقع پر بھاری مالی امداد کی بھی پیشکش کی لیکن کوئی مسلمان حکمران اس پر تیار نہ ہوا۔

دورِ بنو امیہ

اُموی خلیفہ عبد الملک بن مروان نے ۶۸۵ء میں اس چٹان پر ایک گنبد کی تعمیر کا آغاز کیا جہاں سے نبی اکرم ﷺ شبِ معراج میں آسمانوں کی طرف روانہ ہوئے تھے۔ اس گنبد کی تعمیر ۶۹۱ء میں مکمل ہوئی اور یہ ''قبۃ الصخراء'' کے نام سے مشہور ہوا۔ بعد ازاں، اس گنبد کے جنوب مشرق میں اموی خلیفہ ولید بن عبد الملک نے ''مسجدِ اقصیٰ'' کی تعمیر کی۔ یہ تعمیر ۷۰۹ء تا ۷۱۴ء جاری رہی۔ بعد کے ادوار میں بھی مسلمان سلاطین قبۃ الصخراء اور مسجدِ اقصیٰ میں مختلف تعمیراتی کام کراتے رہے۔

پہلی صلیبی جنگ

بیت المقدس کی یہ مقدس سرزمین تقریباً عباسی دور تک مسلمانوں کے ماتحت رہی۔ پھر جیسے جیسے باہمی اختلاف وانتشار، خانہ جنگی، سیاسی فتنوں اور باطنی تحریکوں کی وجہ سے عباسی حکومت کمزور پڑنے لگی تو گھات میں بیٹھے ہوئے صلیبیوں کو موقع مل گیا۔ ادھر فاطمی حکومت نے بھی اپنی حکومت کی مضبوطی، استحکام اور شام میں سلجوقیوں کے خاتمے کے لیے ان صلیبیوں سے مدد طلب کی۔ انہیں کئی طرح کی سہولتیں فراہم کیں اور بیت المقدس میں آنے جانے کی اجازت دے دی۔

پھر حضرت عیسیٰ ؑ کی پیدائش کے ایک ہزار سال مکمل ہونے پر مذہبی رہنماؤں نے یورپ کے عیسائیوں میں بہت جوش وخروش پیدا کیا اور انہیں حضرت عیسیٰ ؑ کی جائے پیدائش یعنی بیت المقدس کو مسلمانوں سے آزاد کرانے کے لیے جنگ پر آمادہ کیا۔ یہ پہلی صلیبی جنگ تھی جس کے لیے زور شور سے تیاری شروع ہوگئی۔ اس کے نتیجے میں ۱۰۹۹ء میں عیسائیوں نے ستر ہزار سے زائد مسلمانوں کو شہید کر کے ان سے بیت المقدس چھین کر اپنی مسیحی حکومت قائم کر دی۔ اس شہرِ مقدس پر عیسائیوں کا قبضہ ۸۸ برس تک رہا۔ مسیحیوں نے مسجدِ اقصیٰ میں بہت ردّوبدل کیا۔ اس میں رہنے کے لیے کمرے بنائے۔ مسجد کا نام معبدِ سلیمان رکھا۔ متعدد عمارتوں کا اضافہ کیا۔ مسجد کے اندر اور اس کے ساتھ گرجے تعمیر کیے۔

سلطان صلاح الدین ایوبیؒ

سلطان صلاح الدین ایوبیؒ نے بیت المقدس کی آزادی کے لیے تقریباً سولہ جنگیں لڑیں۔ بالآخر ۱۱۸۷ء میں پیہم معرکہ آرائیوں کے بعد بیت المقدس کو صلیبیوں سے آزاد کروالیا۔ اس طرح ۸۸ سال بعد بیت المقدس دوبارہ مسلمانوں کے پاس آ گیا اور ارضِ مقدسہ سے عیسائی حکومت کا صفایا ہو گیا۔ اس کے بعد وہاں تقریباً ۷۶۱ برس مسلمانوں کی حکومت رہی۔

خلافتِ عثمانیہ

خلافتِ عثمانیہ کے تابناک دور میں یہودیوں کو فلسطین میں زمین خریدنے، کاروبار کرنے اور رہائش اختیار کرنے کا قانونی حق حاصل نہیں تھا۔ البتہ یہودی ویزا لے کر فلسطین آ سکتے تھے اور مقدس مقامات کی زیارت کر سکتے تھے۔

پہلی جنگِ عظیم

پہلی جنگِ عظیم کے دوران برطانیہ نے سازش کے ذریعے عربوں اور ترکوں کو آپس میں لڑا کر بیت المقدس سے ترکوں کو بے دخل کر دیا۔ پھر مشرقِ وسطیٰ کو کئی عرب ممالک میں تقسیم کر کے اپنی اجارہ داری قائم کر دی۔

بالفور ڈیکلریشن

۱۹۱۷ء میں برطانوی وزیر خارجہ بالفور نے ''اعلانِ بالفور'' کے ذریعے یہودیوں کو فلسطین میں آباد ہونے کی اجازت دے دی۔ چنانچہ ہزاروں یہودیوں نے فلسطین کی طرف ہجرت کی۔ اس طرح یہودیوں کی آبادی بڑھ کر ۸ فیصد ہوگئی جبکہ عرب ۹۲ فیصد تھے۔ یہودیوں نے فلسطینیوں سے منہ مانگے داموں جائیدادیں خریدیں اور جنہوں نے اپنی جائیداد فروخت کرنے سے انکار کیا انہیں برطانوی حکومت کے تعاون سے زبردستی بے دخل کر دیا گیا۔ دستاویزات کے ذریعے ثابت کیا گیا کہ فلاں جائیداد ۲۰۰۰ سال قبل ہمارے فلاں بزرگ کے نام تھی جس پر آج کوئی فلسطینی قابض ہے۔ برطانوی حکومت نے اس طرح کے دعوے قبول کیے اور یوں یہودی فلسطین میں آباد ہوتے چلے گئے۔ یہ دھاندلی مسلسل جاری رہی۔ یہودیوں کو باہر سے لا کر فلسطین میں آباد کیا جاتا رہا جبکہ انہیں ۱۸۰۰ برس قبل یہاں سے نکال دیا گیا تھا۔

۱۹۴۸ء میں اسرائیل کا ناجائز قیام

بالآخر برطانیہ اور امریکہ کی ملی بھگت سے ۱۹۴۸ء میں فلسطین کے ۵۶ فیصد علاقے پر قبضہ کر کے ایک یہودی ریاست اسرائیل کے نام سے قائم کر دی گئی۔ یہودیوں کو جب برطانیہ کے زیر سرپرستی فلسطین میں ناجائز طور پر آباد کیا جا رہا تھا تو اس پر علامہ اقبالؒ نے کہا تھا:

ہے خاکِ فلسطیں پہ یہودی کا اگر حق
ہسپانیہ پر حق نہیں کیوں اہلِ عرب کا؟

پاکستان کے پہلے وزیر اعظم لیاقت علی خان کو امریکا میں پیشکش کی گئی تھی کہ اگر پاکستان اسرائیل کو تسلیم کر لے تو پاکستان کو ناقابلِ تصور مالی امداد دی جائے گی۔ لیاقت علی خان نے جواب میں کہا تھا:

" Gentleman! Our souls are not for Sale ."

۱۹۶۷ء میں جنگ کے دوران اسرائیل نے بیت المقدس سمیت فلسطین کے مزید ۲۲ فیصد علاقہ پر قبضہ کر لیا۔ ۱۹۹۳ء میں پہلی بار فلسطین و اسرائیل کے درمیان براہِ راست ''اوسلو معاہدہ'' ہوا جس میں ۷۸ فیصد حصے پر اسرائیل کا قبضہ تسلیم کر لیا گیا۔ اس کے بعد اسرائیل نے دریائے اردن کے مغربی کنارے اور غزہ سے بتدریج انخلا کرنا تھا لیکن معاہدہ کے باوجود بھی لاکھوں یہودی آبادکاروں کو مقبوضہ علاقوں میں بسایا گیا' بیس ہزار سے زیادہ فلسطینی عمارتوں کو منہدم کیا گیا' بیس ہزار سے زائد فلسطینیوں کو اسرائیلی درندوں نے شہید کیا۔ ۴۴۱ میل لمبی دیوہیکل ناجائز دیوار تعمیر کر کے اہلِ فلسطین کو محصور کر دیا گیا۔ ۲۰۱۸ء میں امریکی صدر ڈونلڈ ٹرمپ نے القدس کو اسرائیل کا دارالحکومت تسلیم کرتے ہوئے' اپنا سفارت خانہ وہاں منتقل کر دیا۔

❀❀❀

بقیہ: خوشامد: حسنِ معاشرت کا بدنما داغ

بڑھ کر روشن' تابناک اور انسانوں کے لیے ترقی و کامرانی' عزّت و وقار کا ضامن کوئی اور نظام سرے سے ہے ہی نہیں! جو کچھ بھی بادیٔ النظر میں ہمارے سامنے ہے ع یہ نمائش سراب کی سی ہے! جب کہ حقیقت تلخیوں کا وہ دریا ہے جس میں ڈوب کر اُبھرنا ممکن ہی نہیں جب تک انسان زندگی کے حقیقی روشن پہلو کو اپنے مدِنظر نہ رکھے۔ ایسا اسلام کی روحانی اور آفاقی تعلیم پر عمل پیرا ہوئے بغیر ممکن نہیں۔

قناعت نہ کر عالمِ رنگ و بُو پر
چمن اور بھی' آشیاں اور بھی ہیں

اور ؎

اسی روز و شب میں اُلجھ کر نہ رہ جا
کہ تیرے زمان و مکاں اور بھی ہیں!

❀❀❀

یَاحَسْرَتَا!

پروفیسر محمد یونس جنجوعہ

اللہ تعالیٰ نے بے شمار مخلوق پیدا کی جبکہ انسان اس کی تخلیق کا شاہکار اور اشرف المخلوقات ہے۔ تمام انسان اللہ ربّ العزت کی بارگاہ میں جواب دہ ہیں۔ جو انسان اللہ تعالیٰ کی رضا والے کام کرے گا وہ حساب کے دن کامیاب ٹھہرے گا اور جنّت کی نعمتوں کا مستحق قرار پائے گا' جبکہ جو شخص اللہ تعالیٰ کی نافرمانی والے کام کرے گا وہ سزا پائے گا۔

اللہ تعالیٰ نے انسان کو سمجھ بوجھ عطا فرمائی ہے۔ وہ اچھائی برائی میں تمیز کرسکتا ہے' کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اس کی فطرت میں نیکی اور بدی کا شعور رکھ دیا ہے۔ قرآن مجید میں ارشاد ہے:

﴿فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَتَقْوٰىهَا ۝٨﴾ (الشمس)

یعنی اللہ تعالیٰ نے نفسِ انسانی میں نافرمانی والے کام اور پرہیزگاری کے کام الہام کر دیے ہیں۔ ہر شخص جانتا ہے کہ چوری کرنا اور جھوٹ بولنا اچھا نہیں ہے۔ سچی بات کرنا اور دوسروں کے کام آنا اچھا ہے۔ دنیا کی زندگی پُرکشش اور خوشنما ہے۔ انسان نفس اور شیطان کے بہکاوے میں آ کر اور دنیاوی لالچ میں اُلجھ کر اپنے نقد مفاد کی خاطر اللہ تعالیٰ کی نافرمانی والے کام کر گزرتا ہے' حالانکہ اسے اچھی طرح معلوم ہے کہ بُرائی کا بدلہ بُرائی ہی ہوگا۔ اس بات کو بھی اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں واضح کر دیا ہے' فرمایا:

﴿خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَيٰوةَ لِيَبْلُوَكُمْ اَيُّكُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا ؕ﴾ (الملک:۲)

''اس نے موت اور حیات اس لیے بنائی تاکہ وہ تمہیں آزمائے کہ تم میں سے کون ہیں جو اچھے اعمال کرتے ہیں۔''

بلاشبہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں پر مہربان ہے۔ اُس نے لوگوں کی راہنمائی کے لیے ہر زمانے میں اپنے پیغامبر بھیجے تاکہ وہ لوگوں کو اچھے کاموں کا حکم دیں اور برے کاموں سے روکیں۔ انبیاء کرام علیہم السلام نے اپنی زندگی میں اچھے عمل کیے اور برے کاموں سے بچ کر دکھایا۔ رسول

اللہ ﷺ روئے زمین پر آخری پیغمبر ہیں۔ ان کی زندگی قیامت تک کے انسانوں کے لیے بہترین نمونہ ہے۔ ارشادِ الٰہی ہے:

﴿لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ﴾ (الاحزاب:۲۱)

''بے شک رسول اللہ (محمد ﷺ) کی زندگی میں تمہارے لیے بہترین نمونہ ہے۔''

سارے انبیاء و رُسل علیہم السلام کے ساتھ ان کے مخاطبین کی اکثریت نے اچھا سلوک نہ کیا۔ اسی طرح رسول اللہ ﷺ کے ساتھ بھی اچھا سلوک نہ کیا گیا' اگرچہ آپؐ کی خوبصورت اور بے غرض زندگی سب کے سامنے تھی۔ مخالفت کی وجہ اس کے سوا کچھ نہ تھی کہ وہ لوگ ظاہری اور جھوٹے دنیاوی مفادات کو چھوڑنا نہ چاہتے تھے۔ وہ اپنے خالق کو بھول چکے تھے۔ یہ فراموش کر چکے تھے کہ برائیوں کا بدلہ انہیں سزا اور عذاب کی صورت میں ملے گا۔ گمراہی میں اس قدر ڈوبے ہوئے تھے کہ آخرت کا بھی انکار کر رہے تھے۔ وہ نہیں مان رہے تھے کہ موت کے بعد پھر زندگی ملے گی۔ وہ قطعاً غافل تھے اور من مانے طریقے سے زندگی گزار رہے تھے۔

عقل سلیم کی رُو سے یہ ماننا ضروری ہے کہ ایک وقت ایسا ہو جب نیکوں کو جزا ملے اور بروں کو سزا ملے' اس لیے کہ دنیا کی زندگی میں یہ ممکن ہی نہیں ہے کہ ہر نیک آدمی کے ساتھ اچھا سلوک ہو اور بروں کو ان کی برائی کی سزا ملے۔ کتنے ہی نیک لوگ زمانے کے ہاتھوں تکالیف برداشت کر رہے ہیں جبکہ بدکردار اور ظالم دندناتے پھر رہے ہیں۔ کیا احکم الحاکمین کو یہ پسند ہے؟ ہرگز نہیں! انصاف کا تقاضا یہ ہے کہ ظالم اپنے ظلم کی سزا پائیں اور فرماں برداروں کو اچھا بدلہ ملے۔ طلبہ کا ایک دن نتیجے کا ہوتا ہے جب محنت کرنے والے کامیاب ہوتے ہیں اور محنت سے جی چرانے والے ناکامی کا منہ دیکھتے ہیں۔ یہی حال ہر انسان کا ہے کہ اگر وہ اللہ کے رسول ﷺ کی زندگی سے راہنمائی لے کر اچھے کام کرتا ہے تو فیصلے کے دن کامیاب ہوگا۔ بصورت دیگر اسے اپنی بداعمالی کی سزا بھگتنا پڑے گی۔ قرآن مجید میں فرمایا گیا:

﴿يَوْمَ يَفِرُّ الْمَرْءُ مِنْ اَخِيْهِ ۝٣٤ وَاُمِّهٖ وَاَبِيْهِ ۝٣٥ وَصَاحِبَتِهٖ وَبَنِيْهِ ۝٣٦﴾ (عبس)

''اس دن آدمی اپنے بھائی سے دُور بھاگے گا' اور اپنی ماں اور اپنے باپ سے' اور اپنی بیوی اور بیٹوں سے (دور بھاگے گا)۔''

یعنی کوئی عزیز سے عزیز رشتہ دار یا دوست وہاں کام نہیں آئے گا۔ ایک اور مقام پر واضح کیا گیا:

﴿وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰی ؕ وَاِنْ تَدْعُ مُثْقَلَةٌ اِلٰی حِمْلِهَا لَا يُحْمَلْ مِنْهُ شَيْءٌ وَّلَوْ كَانَ ذَا قُرْبٰی ؕ﴾ (فاطر:۱۸)

’’کوئی اٹھانے والا کسی دوسرے کا بوجھ نہ اٹھائے گا۔ اور اگر کوئی بوجھ میں دبا ہوا اپنا بوجھ ہٹانے کے لیے کسی کو بلائے تو کوئی اس میں سے کچھ نہ اٹھائے گا اگرچہ قرابت دار ہی ہو۔‘‘

یعنی ہر ایک کو فرداً فرداً اپنا حساب دینا ہوگا۔ ازروئے الفاظِ قرآنی:

﴿وَكُلُّهُمْ اٰتِيْهِ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ فَرْدًا ۝۹۵﴾ (مریم)

’’اور قیامت کے دن سب کے سب آنے والے ہیں اُس کے پاس اکیلے اکیلے۔‘‘

قرآن مجید میں کئی جگہ اس بات کا ذکر ہوا ہے کہ دنیا میں بااثر لوگوں کے پیروکار آخرت میں انہیں مدد کے لیے پکارنا چاہیں گے مگر وہ ان کے کسی کام نہ آئیں گے۔

دنیا میں اگر کوئی انسان ناکام ہوتا ہے تو اس کے لیے موقع ہوتا ہے کہ وہ اپنی کوتاہیوں کو دور کر لے اور باقی زندگی میں اپنا رویہ بدل کر ایک کامیاب انسان بن جائے‘ لیکن جو انسان عقل سلیم کے مخالف چل کر اپنی زندگی ختم کر بیٹھتا ہے اس کے لیے تلافی کی کوئی گنجائش نہیں رہتی‘ کیونکہ موت کے ساتھ ہی انسان دارالعمل سے نکل کر دارالجزاء میں پہنچ جاتا ہے۔ اب وہ جتنا مرضی اپنی نافرمانیوں پر پچھتائے‘ بیکار ہوگا۔ فرعون نے بھی مرتے مرتے کہہ دیا تھا کہ میں بھی اُس رب پر ایمان لاتا ہوں جس پر بنی اسرائیل ایمان لائے‘ مگر اُس کا یہ کہا کام نہ آیا اور وہ اپنے انجامِ بد کو پہنچا۔ بدکردار لوگ جب آخرت کی زندگی میں پہنچ جائیں گے اور اپنے انجام بد کو دیکھ لیں گے تو وہ دنیا میں واپس آنا چاہیں گے۔ ان کی خواہش ہوگی کہ ہم نیک کاموں میں لگ جائیں مگر اس وقت مہلت ختم ہو چکی ہوگی۔ عمل کرنے کا موقع تو بس موت سے پہلے تک ہی ہے۔ ملاحظہ ہوں آیاتِ قرآنی:

﴿وَلَوْ تَرٰۤی اِذِ الْمُجْرِمُوْنَ نَاكِسُوْا رُءُوْسِهِمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ ؕ رَبَّنَاۤ اَبْصَرْنَا وَسَمِعْنَا فَارْجِعْنَا نَعْمَلْ صَالِحًا اِنَّا مُوْقِنُوْنَ ۝۱۲﴾ (السجدۃ)

’’اور جب تم دیکھو گے گنہگار اپنے پروردگار کے سامنے سر جھکائے ہوں گے (اور کہیں گے) اے ہمارے پروردگار! ہم نے دیکھ لیا اور سن لیا تو ہم کو (دنیا میں) واپس بھیج

دے کہ نیک عمل کریں‘ بے شک ہم یقین کرنے والے ہیں۔‘‘

﴿اَنْ تَقُوْلَ نَفْسٌ يّٰحَسْرَتٰى عَلٰى مَا فَرَّطْتُّ فِيْ جَنْۢبِ اللّٰهِ وَاِنْ كُنْتُ لَمِنَ السّٰخِرِيْنَ ۝۵۶﴾ (الزمر)

’’مبادا کہ اُس وقت کوئی جان یہ کہے کہ ہائے افسوس اس کوتاہی پر جو مجھ سے اللہ کی جناب میں ہوئی اور مَیں تو مذاق اڑانے والوں ہی میں شامل رہا۔‘‘

﴿اَوْ تَقُوْلَ حِيْنَ تَرَى الْعَذَابَ لَوْ اَنَّ لِيْ كَرَّةً فَاَكُوْنَ مِنَ الْمُحْسِنِيْنَ ۝۵۸ بَلٰى قَدْ جَآءَتْكَ اٰيٰتِيْ فَكَذَّبْتَ بِهَا وَاسْتَكْبَرْتَ وَكُنْتَ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ ۝۵۹﴾ (الزمر)

’’یا جب وہ عذاب دیکھ لے تو یوں کہے کہ اگر مجھے ایک دفعہ (دنیا میں) لوٹنا نصیب ہو جائے تو مَیں نیکوکاروں میں ہو جاؤں۔ (اللہ فرمائے گا) ہرگز نہیں! تیرے پاس میری آیتیں پہنچ گئی تھیں مگر تو نے انہیں جھٹلا دیا اور تکبر کرنے لگا اور تو کافر بن گیا۔‘‘

انسان کے لیے تو اللہ تعالیٰ پر ایمان بالغیب لانا مطلوب تھا۔ جب عذاب دیکھ لیا تو اب ایمان لانے اور نیکوکار بننے کی حسرت کرنا بے فائدہ ہے۔ جہنمی دوزخ میں فریاد کریں گے کہ ان کے عذاب میں کچھ تخفیف ہی کر دی جائے‘ لیکن یہ بھی ممکن نہ ہوگا۔

﴿وَقَالَ الَّذِيْنَ فِي النَّارِ لِخَزَنَةِ جَهَنَّمَ ادْعُوْا رَبَّكُمْ يُخَفِّفْ عَنَّا يَوْمًا مِّنَ الْعَذَابِ ۝۴۹﴾ (المؤمن)

’’جو لوگ آگ میں (جل رہے) ہوں گے وہ دوزخ کے داروغوں سے کہیں گے کہ اپنے پروردگار سے دعا کرو کہ ایک روز کے لیے تو ہم سے عذاب ہلکا کر دے۔‘‘

فیصلے کے دن مجرموں کی کوئی فریاد نہ سنی جائے گی‘ کیونکہ وہ عمل کا وقت ضائع کر چکے تھے۔ اب تو ان کے لیے صرف عذاب ہی عذاب ہوگا جو کسی وقت ہلکا نہ کیا جائے گا۔ دوزخی اچھے کام کرنے کی آرزو کر کے وہاں سے نکالے جانے کی تمنا کریں گے۔

﴿وَهُمْ يَصْطَرِخُوْنَ فِيْهَا ۚ رَبَّنَاۤ اَخْرِجْنَا نَعْمَلْ صَالِحًا غَيْرَ الَّذِيْ كُنَّا نَعْمَلُ ؕ اَوَلَمْ نُعَمِّرْكُمْ مَّا يَتَذَكَّرُ فِيْهِ مَنْ تَذَكَّرَ وَجَآءَكُمُ النَّذِيْرُ ؕ فَذُوْقُوْا فَمَا لِلظّٰلِمِيْنَ مِنْ نَّصِيْرٍ ۝۳۷﴾ (فاطر)

’’اور وہ اس میں چیخ و پکار کریں گے: اے ہمارے پروردگار! ہمیں (یہاں سے)

نکال لے! اب ہم نیک اعمال کریں گے‘ ان اعمال سے مختلف جو ہم (پہلے) کیا کرتے تھے۔ (جواب ملے گا:) کیا ہم نے تمہیں اتنی عمر نہیں دی تھی کہ اس میں سبق حاصل کر لیا جس نے سبق حاصل کرنا چاہا اور تمہارے پاس خبردار کرنے والا بھی تو آیا تھا! تو اب چکھو (مزہ اس عذاب کا اور یاد رکھو کہ) ظالموں کے لیے کوئی مددگار نہیں ہے۔‘‘

وقت گزر چکا تو اب نہ کوئی آرزو کام آئے گی نہ فریاد۔ جب دی ہوئی مہلت بے کار گنوا دی تو اب چیخنا چلانا بے سود ہے۔

دنیا میں بعض بااثر لوگ کم تر حیثیت کے لوگوں کو جھوٹے وعدے دے کر اپنے پیچھے لگا لیتے ہیں۔ ان کی پیروی کرنے والے جب حساب کتاب کے وقت ان کو بلائیں گے تو وہ کسی کام نہ آئیں گے۔

﴿وَاِذۡ یَتَحَآجُّوۡنَ فِی النَّارِ فَیَقُوۡلُ الضُّعَفٰٓؤُا لِلَّذِیۡنَ اسۡتَکۡبَرُوۡۤا اِنَّا کُنَّا لَکُمۡ تَبَعًا فَہَلۡ اَنۡتُمۡ مُّغۡنُوۡنَ عَنَّا نَصِیۡبًا مِّنَ النَّارِ ﴿۴۷﴾ قَالَ الَّذِیۡنَ اسۡتَکۡبَرُوۡۤا اِنَّا کُلٌّ فِیۡہَاۤ ۙ اِنَّ اللّٰہَ قَدۡ حَکَمَ بَیۡنَ الۡعِبَادِ ﴿۴۸﴾﴾ (المؤمن)

’’اور جب وہ آگ میں ایک دوسرے سے جھگڑیں گے تو کمزور لوگ بڑے بننے والوں سے کہیں گے: ہم تو تمہاری پیروی کیا کرتے تھے‘ تو کیا تم لوگ ہم سے آگ کے عذاب کا کوئی حصہ کم کروا سکتے ہو؟ وہ بڑے بننے والے کہیں گے کہ ہم سبھی اس کے اندر پڑے ہوئے ہیں‘ اللہ نے تو اپنے بندوں کے مابین فیصلہ کر دیا ہے۔‘‘

لہٰذا دنیاوی زندگی میں دوستی اس کے ساتھ لگائی جائے اور اس کا کہنا مانا جائے جو کتاب و سنت کے احکام بتائے اور خود بھی عالم باعمل ہو۔ فسق و فجور اور لہو و لعب میں مبتلا کرنے والے دوست روزِ قیامت حسرت و ندامت کا باعث بنیں گے۔ اُس روز انسان کہے گا:

﴿یٰوَیۡلَتٰی لَیۡتَنِیۡ لَمۡ اَتَّخِذۡ فُلَانًا خَلِیۡلًا ﴿۲۸﴾﴾ (الفرقان)

’’ہائے میری شامت! کاش میں نے فلاں شخص کو دوست نہ بنایا ہوتا!‘‘

فی سبیل اللہ خرچ کرنا ایک ایسا عمل ہے جس کی بابت انسان موت کے وقت پچھتائے گا کہ کیوں نہ میں نے اپنا مال اللہ کی راہ میں خرچ کیا۔

﴿وَاَنۡفِقُوۡا مِنۡ مَّا رَزَقۡنٰکُمۡ مِّنۡ قَبۡلِ اَنۡ یَّاۡتِیَ اَحَدَکُمُ الۡمَوۡتُ

فَیَقُوۡلَ رَبِّ لَوۡلَاۤ اَخَّرۡتَنِیۡۤ اِلٰۤی اَجَلٍ قَرِیۡبٍ ۙ فَاَصَّدَّقَ وَاَکُنۡ مِّنَ الصّٰلِحِیۡنَ ﴿۱۰﴾ وَلَنۡ یُّؤَخِّرَ اللّٰہُ نَفۡسًا اِذَا جَآءَ اَجَلُہَا ؕ وَاللّٰہُ خَبِیۡرٌۢ بِمَا تَعۡمَلُوۡنَ ﴿۱۱﴾﴾ (المنٰفقون)

’’اور خرچ کر دو اس میں سے جو کچھ ہم نے تمہیں دیا ہے اس سے پہلے پہلے کہ تم میں سے کسی کی موت کا وقت آجائے پھر وہ اُس وقت کہے کہ اے میرے رب! تو نے مجھے ایک قریب وقت تک کیوں مہلت نہ دی کہ میں صدقہ کرتا اور نیک لوگوں میں سے ہو جاتا! اور اللہ ہرگز مہلت نہیں دے گا کسی جان کو جب اُس کا وقتِ معین آپہنچے گا۔ اور جو کچھ تم کر رہے ہو اللہ اُس سے باخبر ہے۔‘‘

جس نے اپنی دولت عیش و عشرت میں خرچ کی یا سنبھال سنبھال کر رکھی تو ایسا شخص افسوس کرے گا کہ مَیں نے کیوں نہ اپنا مال فی سبیل اللہ خرچ کیا۔ موت کے وقت وہ تمنا کرے گا کہ اسے اور مہلت ملتی تو وہ اپنا مال اللہ تعالیٰ کی رضا والے کاموں میں خرچ کرتا‘ مگر اللہ تعالیٰ نے واضح طور پر بتا دیا کہ موت آجانے کے بعد ذرا بھی مہلت نہ دی جائے گی۔ قرآن مجید میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿قُلۡ لَّکُمۡ مِّیۡعَادُ یَوۡمٍ لَّا تَسۡتَاۡخِرُوۡنَ عَنۡہُ سَاعَۃً وَّلَا تَسۡتَقۡدِمُوۡنَ ﴿۳۰﴾﴾ (سبا)

’’کہہ دو کہ تم سے ایک دن کا وعدہ ہے جس سے نہ ایک گھڑی پیچھے رہو گے نہ آگے بڑھو گے۔‘‘

کسی فردِ بشر کو معلوم نہیں کہ اُس کی موت کا وقت کب ہے۔ لہٰذا ہر شخص ہر وقت موت کے لیے اس طرح تیار رہے کہ اسے کسی طرح کی حسرت رہے نہ پچھتاوا!

❁❁❁

اپنے ذاتی اوقات میں سے کم از کم نصف گھنٹہ نکال کر ’’بیان القرآن‘‘ کے ترجمہ و ترجمانی کا ضرور مطالعہ کریں‘ آپ یقیناً مستفید ہوں گے۔ (ان شاء اللہ!)

خوشامد: حسنِ معاشرت کا بدنما داغ

راحیل گوہر صدیقی ☆

اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے ہر انسان کے خمیر میں اچھائی اور برائی کا مادّہ رکھ دیا ہے۔ اب یہ انسان پر منحصر ہے کہ وہ اپنے لیے کون سا راستہ اور طرزِ زندگی اختیار کرتا ہے' کیوں کہ اللہ تعالیٰ نے اس کو دونوں راستوں پر چلنے کی آزادی دے دی۔ دراصل یہ دنیا اور پوری خلقت بنانے کا مقصد انسان کا امتحان لینا ہے اور امتحان ہاتھ پیر باندھ کر نہیں لیا جاسکتا' کچھ نہ کچھ رعایت دینی ہی پڑتی ہے۔ اس امتحان کی اساس خیر وشر ہے۔ انسان اپنے شعور وادراک سے کام لے کر اس امتحان میں کامیاب بھی ہوسکتا ہے' یا پھر بے شعوری کی زندگی گزار کر سیدھی راہ سے کوسوں دور بھی جاسکتا ہے۔ اس کے طرزِ عمل میں کئی محرکات کا عمل دخل ہوتا ہے۔ کچھ تو معاشرے میں پھیلی ہوئی کج روی' تربیت کا فقدان اور کچھ انسان کا اپنا برائی کی طرف میلانِ طبع!

انسان کے جسمانی عوارض دوسروں پر اتنے اثر انداز نہیں ہوتے جتنے کہ اس کی باطنی بیماریاں معاشرے میں فتنہ وفساد کا باعث بنتی ہیں۔ ہمارے معاشرے کے کچھ افراد کو ایک بڑی سنگین بیماری لاحق ہوتی ہے اور وہ ہے خوشامد' چاپلوسی اور کسی کی بے جا مدح سرائی۔ خوشامدی شخص اپنے مفاد' لالچ اور خود غرضی کے لیے کسی کی بے محل تعریف اور مدح کے پُل باندھتا رہتا ہے تا کہ اپنے مخاطب کو خوش کر کے اس سے مالی اور دیگر فوائد حاصل کرے۔ یہ قبیح عمل اسے جن گناہوں کا مرتکب بنا تا ہے اسے اس کا احساس تک نہیں ہوتا۔ ایک یہ کہ جس شخص کی وہ تعریف کرتا ہے وہ اس کا مستحق نہیں ہوتا اور یہ بات خوشامدی بھی خوب جانتا ہے۔ جو وہ کہہ رہا ہوتا ہے اس کو ماننے پر خود اس کا دل آمادہ نہیں ہوتا لیکن پھر بھی اپنی غرض کے لیے کرتا ہے۔ گویا اس کی زبان پر جو ہوتا ہے وہ اس کے دل میں نہیں ہوتا۔ اسی کیفیت کو منافقت کہتے ہیں' جو کفر سے زیادہ سنگین گناہ ہے۔

☆ معاون مسئول' شعبہ تصنیف وتالیف' قرآن اکیڈمی' لیسین آباد' کراچی

دوسرے یہ کہ دنیاوی فائدوں کے لیے اہلِ ثروت اور اربابِ اختیار کی تعریف ایک نہ ایک دن اسے لوگوں کی نظروں میں ذلیل ورسوا کروا دیتی ہے اور لوگوں کا اعتماد اس پر سے اُٹھ جاتا ہے۔ پھر اگر وہ کبھی سچ بھی بولے تب بھی کوئی یقین نہیں کرتا۔

اس قابلِ نفرت عادت کی وجہ سے وہ شخص جس کی جھوٹی تعریفیں کی گئی ہوتی ہیں' وہ ایک قسم کے احساسِ برتری میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ وہ خود کو معاشرے کا افضل ترین شخص سمجھتا ہے۔ اس خیال کے تحت وہ اپنے سے کم تر لوگوں کو منہ لگانا پسند نہیں کرتا اور بڑائی اور تکبر کا شکار ہو جاتا ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ معاشرے کا ہر فرد اس کو ایسا ہی مقام دے۔ پچھلے دور میں بادشاہوں' شہزادوں' امیروں کے رویے اور طرزِ عمل میں خوشامدیوں ہی کی وجہ سے غرور وتمکنت کا عنصر غالب آجاتا تھا۔ یہ بیماری آج ہمارے معاشرے میں ایک وبا کی طرح پھیلی ہوئی ہے۔ اس ناسور نے انسانوں میں چھوٹے بڑے کی تفریق پیدا کردی ہے۔ اگر کسی کے پاس چار پیسے آجائیں تو وہ دوسروں کو خاطر میں نہیں لاتا۔

حضرت عبدالرحمٰن بن بکرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک آدمی نے نبی اکرم ﷺ کے پاس کسی دوسرے آدمی کی تعریف بیان کی تو آپ ﷺ نے فرمایا:

((وَيْحَكَ قَطَعْتَ عُنُقَ صَاحِبِكَ ، قَطَعْتَ عُنُقَ صَاحِبِكَ ، مِرَارًا، إِذَا كَانَ أَحَدُكُمْ مَادِحًا صَاحِبَهُ لَا مَحَالَةَ فَلْيَقُلْ: أَحْسِبُ فُلَانًا وَاللّٰهُ حَسِيبُهُ ، وَلَا أُزَكِّي عَلَى اللهِ أَحَدًا أَحْسِبُهُ إِنْ كَانَ يَعْلَمُ ذَاكَ كَذَا وَكَذَا)) (صحیح مسلم)

''تجھ پر افسوس ہے کہ تو نے اپنے بھائی کی گردن کاٹ دی' تو نے اپنے بھائی کی گردن کاٹ دی۔ آپ ﷺ نے اسے کئی مرتبہ دہرایا۔ (پھر فرمایا) جب تم میں سے کوئی آدمی اپنے ساتھی کی تعریف ہی کرنا چاہے تو اسے چاہیے کہ وہ ایسے کہے: میرا گمان یہ ہے اور اللہ خوب جانتا ہے' اور مَیں اس کے دل کا حال نہیں جانتا' انجام کا علم اللہ ہی کو ہے کہ وہ ایسے ایسے ہے۔''

اس حدیث میں منقول رسول اللہ ﷺ کے یہ الفاظ کہ ''تُو نے اپنے بھائی کی گردن کاٹ دی'' یعنی تُو نے اپنے بھائی کو ہلاک کر دیا' معمولی نہیں ہیں جو ان کو نظر انداز کر دیا جائے' بلکہ ہمارے پیارے رسول ﷺ کے ہر حکم میں ہزاروں حکمتیں پوشیدہ ہوتی ہیں' اور اس میں ایک حکمت کی

بات یہ بھی ہے کہ کہیں وہ بندہ غرور و تکبر کا شکار نہ ہو جائے۔

حضرت معاویہ ؓ بیان فرماتے ہیں کہ مَیں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ ارشاد فرماتے سنا: ((اِیَّاکُمْ وَالتَّمَادُحَ فَاِنَّهُ الذَّبْحُ)) ''ایک دوسرے کی خوشامد اور بے جا تعریف سے بہت بچا کرو' کیونکہ یہ تو ذبح کرنے کے مترادف ہے۔'' (سنن ابن ماجہ) اس فرمانِ رسول ﷺ سے واضح ہوا کہ کسی انسان کے سامنے اُس کی تعریف کرنا اُس کو ہلاک کرنے کے مترادف ہے۔ یعنی ہو سکتا ہے کہ وہ شخص خود پسندی اور تکبر کا شکار ہو جائے اور شیطان کی طرح گمراہ ہو جائے۔

ہمام رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ ایک شخص آیا اور اس نے حضرت عثمان ؓ کی اُن کے منہ پر تعریف کرنا شروع کر دی۔ اس پر مقداد بن الاسود ؓ نے ایک مٹھی مٹی اٹھائی اور اُس کے چہرے پر پھینک دی اور فرمایا کہ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے: ''جب تم منہ پر تعریف کرنے والوں سے ملو تو ان کے چہروں پر مٹی ڈال دیا کرو۔'' (سنن ابوداوٗد)

خیر و شر کی دو ہی ممکنہ صورتیں ہیں: ایک فاعلی اور دوسری مفعولی۔ فاعلی صورت میں ہم کسی کے لیے خیر یا شر کا باعث بن رہے ہوتے ہیں اور مفعولی حالت میں ہم خود کسی ذریعے یا وسیلے سے خیر یا شر حاصل کرتے ہیں۔ دانستہ یا نادانستہ ہم سے یہ اعمال صادر ہو رہے ہوتے ہیں۔

بدکردار اور خوشامدی لوگوں کا وجود جونک کی طرح افرادِ معاشرہ سے چمٹا رہتا ہے اور ان کے صحت مند خون پی کر ان کے اندر زہر آلود خون کی آمیزش کرتا رہتا ہے۔ خوشامدی لوگ چاپلوسی اور کاسہ لیسی سے وہ کچھ حاصل کر لیتے ہیں جس کے وہ بالکل حق دار نہیں ہوتے۔ انسانوں کی اکثریت اپنی تعریف اور مدح سن کر روحانی سکون حاصل کرتی ہے۔ جب کوئی ان کے ساتھ یہ رویہ اختیار کرتا ہے تو پھر give and take کے اصول پر عمل کرتے ہوئے وہ بھی خوشامدی کو نواز دیتے ہیں۔

جب خوشامد' چاپلوسی اور جھوٹی تعریفوں کے نتیجہ میں کسی کو کوئی عہدہ' منصب یا اختیار حاصل ہو جاتا ہے تو وہ اس اختیار اور منصب سے ناجائز فائدے اٹھاتا ہے۔ اقربا پروری کے ساتھ ساتھ سیاسی' سماجی اور معاشی مراعات کا غیر منصفانہ حصول بھی خوشامدی کے لیے بہت آسان ہو جاتا ہے۔ جب کوئی شخص کسی منصب کا اہل ہی نہ ہو اور اس کے ہاتھ میں اختیارات دے دیے جائیں تو پھر اس معاشرے کی اخلاقی' سماجی اور سیاسی بربادی کو کوئی نہیں روک

سکتا۔ کسی قوم پر جب بھی کوئی تباہی آتی ہے تو اس میں مراعات یافتہ طبقہ کا بہت بڑا ہاتھ ہوتا ہے' کیوں کہ ان لوگوں سے باز پرس کرنے اور ان کو نکیل ڈالنے والا کوئی نہیں ہوتا۔ جن لوگوں نے اسے وہ منصب سونپا ہوتا ہے خود ان کے مفادات اس شخص سے وابستہ ہوتے ہیں۔ عوام کے ساتھ ناانصافیاں' ظلم و ستم' اور ان کو بنیادی ضرورتوں تک سے محروم رکھنے میں یہی مراعات یافتہ طبقہ ہراول دستے کا کام دیتا ہے۔ صاحب اقتدار کی خوشامد' ان کی ہاں میں ہاں ملاتے رہنا اور ''سب ٹھیک ہے'' کی لوری سناتے رہنا خوشامدیوں کا بہت بڑا ہتھیار ہوتا ہے۔ جو تعریفیں کسی کے منہ پر کی جاتی ہیں ان کو سن کر آدمی کا نفس موٹا ہو جاتا ہے اور پھر ایسے شخص کو اپنے عیب بھی ہنر نظر آنے لگتے ہیں۔ اسی لیے کہتے ہیں کہ تعریف اصل میں وہ صحیح ہوتی ہے جو انسان کی غیر موجودگی میں کی جائے۔ عملی اعتبار سے معاملہ بالکل اُلٹ ہے کہ لوگ تعریفیں آدمی کے منہ پر کرتے ہیں جبکہ برائی اس کی عدم موجودگی میں۔ غیبت جیسے گھناؤنے گناہ کے مرتکب ہو کر اللہ تعالیٰ کے غضب کا شکار بنتے ہیں۔ غیبت کرنے میں بھی آدمی کو ایک طرح کی لذت اور زبان کی چاشنی محسوس ہوتی ہے۔

جھوٹی تعریف کرنے یا سننے کی بری عادت کے مضر اثرات وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ محسوس ہونے لگتے ہیں۔ ان کا اثر انسان کی شخصیت پر بھی ہوتا ہے اور معاشرہ کی صحت پر بھی! ایک جھوٹی خوشی کے علاوہ اس کا کوئی فائدہ نہیں' البتہ نقصان بہت زیادہ ہیں۔

خوشامد اپنی ذات میں جھوٹ اور منافقت ہی کی دوسری صورت ہے۔ جھوٹ ایک سنگین برائی ہے' نہ صرف آخرت کے پہلو سے بلکہ دنیا کے معاملات میں بھی۔ جھوٹا آدمی ہمیشہ کے لیے بے اعتبار اور بے وقار ہو کر رہ جاتا ہے۔ وہ اللہ تعالیٰ کی ہدایت سے بھی محروم رہتا ہے۔

خوشامد ایک پہلو سے دوستی کی ضد ہے۔ ایک سچے دوست میں ہی یہ وصف ہوتا ہے کہ وہ اپنے دوست کے اندر پائی جانے والی برائیوں کی نشان دہی کر کے محبت آمیز انداز میں اس کی اصلاح کی کوشش کرتا رہے۔ اگر کوئی کسی کو اپنا سچا اور مخلص دوست سمجھتا ہے تو وہ اس کی بات کو غور سے سننے اور اس پر عمل کرنے کی کوشش کرے گا۔ سچی دوستی ان اوصافِ حمیدہ میں سے ہے جن کے دم پر کوئی اپنے دوست کے سامنے اس کے اچھے اور برے افعال کا فرق بغیر کسی تضحیک اور تحقیر کے واضح کر سکتا ہے۔ وہ اپنے دوست کو یہ یقین دلائے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کو بہترین

ساخت پر پیدا کیا ہے‘ اسے اللہ کے عطا کیے ہوئے اس مقام سے نیچے نہیں گرنا چاہیے۔ یہ اللہ کی نعمت کی ناقدری بھی ہے اور اُس کی نافرمانی بھی!

اس کے برخلاف‘ ایک چاپلوس انسان بظاہر تو سب کا ہوتا ہے لیکن حقیقت میں کسی کا بھی نہیں ہوتا۔ کسی کا خیر خواہ ہونا تو بہت دور کی بات‘ خود اپنا بھی دشمن ہوتا ہے۔ ایسا شخص کسی دوسرے کی ان خصوصیات کی مدح سرائی کرتا رہتا ہے جو حقیقتاً اس شخص میں ہوتی ہی نہیں۔ اپنی حقیر سی خواہشات کی تکمیل کی خاطر وہ معاشرہ کے کسی صاحبِ حیثیت آدمی کی جھوٹی تعریف میں رطب اللسان رہتا ہے۔ اس کا اسے وقتی فائدہ تو ہوتا ہے مگر معاشرے میں اس کی کوئی عزت اور مقام باقی نہیں رہتا۔ آخرکار ذلت ورسوائی ہی اُس کے حصے میں آتی ہے۔

فطری طور پر تقریباً ہر فرد کو یہ احساس ہوتا ہے کہ فلاں فلاں خوبیاں اس میں نہیں ہیں لیکن ایک خوشامدی اور چاپلوس آدمی اُس کی وہی خصوصیات بیان کرنے لگتا ہے۔ یہ لمحہ آدمی کو ایک ایسے دوراہے پر لا کھڑا کرتا ہے کہ اُسے اپنی ذات کا صحیح تعین کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔ ایسے میں ایک باشعور آدمی کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنی کمزوریوں کا ادراک کر کے ذہنی طور پر صحت مند افراد کی صف میں شامل ہو جائے۔ خود کو سوسائٹی کا ایک اچھا اور فہم وفراست والا شخص ثابت کرے۔ البتہ بعض اوقات خود پسندی انسان کے اس اعتراف میں مانع آ جاتی ہے اور وہ خاموش رہ کر ایک چاپلوس انسان سے مغلوب ہو جاتا ہے۔ اس کی باتوں کو مِن وعَن قبول کرتے ہوئے اسی رنگ میں رنگ جاتا ہے جس میں وہ دوست نما دشمن اسے رنگنا چاہتا ہے۔ اس طرح دونوں فرد زندگی کے قیمتی لمحات خیالوں کی جنت میں رہ کر گزارتے رہتے ہیں۔ انسانی شخصیت کو مسخ کرنے والا یہ عمل زندگی کے ہر شعبے‘ یعنی معیشت‘ معاشرت‘ سیاست میں اپنے جلوے دکھاتا رہتا ہے۔

اس تناظر میں دیکھیے تو جھوٹی تعریف کرنے والے اور جھوٹی تعریف قبول کرنے والے‘ دونوں ہی فریق گھاٹے کا سودا کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ آج بالعموم خلافِ واقعہ جھوٹی تعریف ہی ہمارے معاشرے کی شناخت بن کر رہ گئی ہے۔ سچائی کے مطابق بات کرنے کا رواج لوگوں کی زندگی سے مفقود ہو گیا ہے۔ اسلام میں اس طرزِ عمل کی سختی سے ممانعت کی گئی ہے۔ رسولِ مکرم ﷺ کا ارشاد ہے:

((مِن حُسْنِ اِسْلامِ المرءِ تَرْكُهُ مَا لا يَعْنِيهِ)) (رواہ الترمذی وابن ماجہ)

’’کسی شخص کے اسلام کی خوبی یہ ہے کہ وہ لایعنی اور فضول باتوں کو چھوڑ دے۔‘‘

قرآن حکیم ہر مسلمان کے لیے رشد وہدایت کا سرچشمہ ہے۔ اس کے ذریعے سے اللہ تعالیٰ انسان کو صالح بننے کی تعلیم دیتا ہے۔ اسی لیے رسالت مآب ﷺ اس دنیا میں تشریف لائے۔ آپ ﷺ کی پوری زندگی انسانوں کے اخلاق وکردار کی تشکیل وتعمیر ہی میں گزری۔ سیدنا ابوہریرہ ؓ سے روایت ہے‘ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ((اِنَّمَا بُعِثْتُ لِاُتَمِّمَ مَكَارِمَ (وفي رواية صالحَ) الْاَخْلَاقِ)) (سلسلہ الاحادیث الصحیحة :۲۳۹۹) ’’مجھے تو اسی (مقصد) کے لیے مبعوث کیا گیا ہے کہ اخلاقی اقدار کی تکمیل کرسکوں۔‘‘

سلیقہ‘ شعور‘ خود آگاہی انسان کے وہ جوہر ہیں جن کے سبب اس کی زندگی کے معمولات میں حسن پیدا ہوتا ہے۔ کچھ لوگوں میں یہ جوہر بالقوہ (potentially) موجود ہوتا ہے جب کہ بعض اسے اپنے کسب سے‘ ماحول سے سیکھتے ہیں۔ انسانی زندگی کی حقیقت ایک انتہائی پیچیدہ مسئلہ ہے کیوں کہ اس میں مادیت کا عنصر بھی ہے جو انتہائی زورآور ہے اور روحانی جوہر بھی ہے جو انسان کو آسودگی عطا کرتا ہے۔ حقوق وفرائض کا تعین‘ رشتے ناتے‘ ازدواجی تعلقات‘ اولاد کی ذمہ داری‘ ملک وقوم کی فلاح وصلاح کا شعوری احساس انسانی زندگی کے لازمی جزو ہیں۔ یہ زندگی کے وہ دائرے ہیں جن کے درمیان انسانی زندگی اُتھل پُتھل ہوتی رہتی ہے۔

زندگی کا روشن پہلو دیکھنے والے اپنے لیے زادِ راہ خود تلاش کرتے ہیں جب کہ تاریک پہلو پر نظر رکھنے والے زندگی کے حسن ووقار کو اپنے عمل سے خود ہی برباد کر دیتے ہیں۔ کامیابی محض دولت اکٹھی کر لینا یا اعلیٰ دنیاوی مقام حاصل کر لینا ہی نہیں ہے بلکہ ایسی زندگی جی لینا بھی خوش نصیبی ہے جس کی خواہش انسان کرے۔ بسترِ مرگ پر پڑے اکثر مریضوں نے اس افسوس کا اظہار کیا کہ کاش زندگی وہ اپنی مرضی کے مطابق گزارتے نہ کہ دوسروں کو متاثر کرنے میں یا اُن کی خواہشات کے مطابق! اِن مریضوں میں اربوں ڈالرز کی جائداد رکھنے والے بظاہر کامیاب اور مثالی لوگ بھی شامل ہیں۔ کامیابی‘ ناموری اور دنیوی جاہ وجلال کا نشہ انسان کی آنکھوں پر پٹی باندھ دیتا ہے اور پھر اسے کذب وحقائق میں تمیز کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔

دراصل انسان کے خمیر میں خودغرضی اور بے غرضی دونوں عناصر موجود ہیں۔ اس پہلو سے

وہ اکثر اپنے آپ سے نبرد آزما رہتا ہے۔ اپنے فکر وعمل کی صحیح اور موزوں حد بندی نہیں کر سکتا۔ کبھی ایک طرف جھک جاتا ہے اور کبھی دوسری جانب۔ انفرادی حقوق کا بہت زیادہ خیال رکھا جاتا ہے تو جماعتی زندگی کے تقاضے پس پشت ڈال دیے جاتے ہیں اور جب جماعت زیادہ قوت حاصل کر لیتی ہے تو فرد کو ابھرنے اور اپنی صلاحیتیں بروئے کار لانے کا موقع نہیں ملتا۔ وہ جماعت کے شکنجوں میں ایسا جکڑا جاتا ہے کہ اُس کی فطرتِ جدت اور اُپج دب کر رہ جاتی ہے۔

انسانِ کامل کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ وہ اپنے اعجازِ عمل سے تجدیدِ حیات کرتا ہے۔ اُس کی فکر زندگی کے خوابِ پریشاں کی نئی تعبیر پیش کرتی ہے۔ وہ پرانی اصطلاحوں کو نئے معنی پہناتا اور حقائق کی نئی توجیہہ پیش کرتا ہے۔ اس کے ذریعے انسانی صفاتِ عالیہ کا اظہار اعلیٰ سیرت کی شکل میں ہوتا ہے۔

فرد جب دوسروں کی خدمت کو اپنا نصب العین بنالیتا ہے تو وہ اپنے وجود کے بلند ترین مقام تک پہنچتا ہے۔ آدمی انسان اسی وقت بنتا ہے جب وہ اپنی ذات کو ایسے مقاصد سے وابستہ کرے جو خود اُس کے وجود سے بلند تر ہوں۔ جو شخص ایک بامقصد اور نیک زندگی بسر کرتا ہے وہ دراصل ساری انسانیت اور سارے زمانے کے لیے زندگی گزارتا ہے۔

انسانی مسرت کا راز خود غرضی اور نفس پرستی میں نہیں بلکہ کسی ایسے نصب العین کی دائمی اور متواتر تلاش وجستجو میں مضمر ہے جو اپنی ذات کے بجائے دوسروں کی بھلائی سے تعلق رکھتا ہو۔ عام طبیعی ذرّوں کی طرح افراد بھی ایک دوسرے سے الگ نہیں ہوسکتے بلکہ روحانی تعلق میں منسلک ہوتے ہیں جو اخلاق کی بنیاد ہے۔ مادّی اجزاء کی جوہری تحلیل تو ممکن ہے لیکن انسانوں کی جوہری یا انفرادی تحلیل نہیں کی جاسکتی۔ انسانی ارتقا کا منتہا یہ ہے کہ فرد اور جماعت کی اقدارِ حیات میں ہم آہنگی پیدا ہو۔ جو تمدن اس مقصد میں کامیاب ہوجاتا ہے وہی زندگی کی گتھیوں کو اچھی طرح سلجھانے کی صلاحیت رکھتا ہے۔

ایک انسانی زندگی وہ ہے جس کا ذکر قرآن حکیم میں ان الفاظ میں کیا گیا ہے:

﴿ لَهُمْ قُلُوْبٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ بِهَا ۡ وَلَهُمْ اَعْيُنٌ لَّا يُبْصِرُوْنَ بِهَا ۡ وَلَهُمْ اٰذَانٌ لَّا يَسْمَعُوْنَ بِهَا ۭ اُولٰۗىِٕكَ كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ ۭ اُولٰۗىِٕكَ هُمُ الْغٰفِلُوْنَ ١٧٩ ﴾ (الاعراف)

''ان کے دل ہیں لیکن ان سے سمجھتے نہیں' اور ان کی آنکھیں ہیں مگر یہ ان سے دیکھتے نہیں' اور ان کے کان ہیں پر ان سے سنتے نہیں۔ یہ لوگ (بالکل) چارپایوں کی طرح ہیں بلکہ ان سے بھی بھٹکے ہوئے۔ یہی لوگ ہیں جو غفلت میں پڑے ہوئے ہیں۔''

انہیں اپنی زندگی کا مقصد ہی معلوم نہیں۔ اکل وشرب' جنسی خواہشات کی تکمیل' معاشرے کے صاحبِ اختیار اور سیاہ وسفید کے مالک کی چاپلوسی' خوشامد اور کاسہ لیسی کرنے ہی میں ان کو اپنی زندگی کی بقا اور سلامتی کا راستہ سجھائی دیتا ہے۔ جسمانی اور ذہنی طور پر ایک غلامانہ زندگی گزارنے میں ہی انہیں اپنی عافیت اور کامیابی دکھائی دیتی ہے۔ یہ انسانی معاشرے کے وہ طبقات ہیں جو ایک ناسور کی مانند حسنِ معاشرت کو بدنما اور اس کی قوت واستحکام کو کمزور کرتے رہتے ہیں۔ معاشرے کے اخلاقی ستونوں کو دھیرے دھیرے کھوکھلا کرتے رہتے ہیں۔ باشعور' فہم وادراک کے حامل اور ملک وقوم کے خیرخواہ افراد کو ان آستین کے سانپوں سے ہر دَم چوکس رہنے کی ضرورت ہے۔ یہ لوگ ہمارے اردگرد ہی ہوتے ہیں' بس ان کو پہچاننے کی صلاحیت اور فہم وفراست کا ہونا شرط ہے۔

اسلام امن وسلامتی اور رواداری کا دین ہے۔ وہ انسانی معاشرے میں کسی پہلو اور کسی رُخ سے بھی کوئی ایسا رخنہ چھوڑنا نہیں چاہتا جس کی وجہ سے بے راہ روی یا داخلی ٹوٹ پھوٹ کا امکان پیدا ہوجائے۔ اسی لیے اسلام نے اپنے پیروکاروں کو ایسے سنہری اصول اور ضابطے دیے ہیں جن پر عمل کرکے وہ اپنی انفرادی اور اجتماعی دونوں حیثیتوں میں ایک مطمئن' آسودہ اور سکون وعافیت کی زندگی گزار سکیں۔ اب اگر انسان زندگی کی راہ میں رکھے ہوئے اسی ایک چراغ ہی کو بجھادے اور اپنے راستے کو تاریک بنالے تو ایسے انسان کے لیے کچھ نہیں کیا جاسکتا۔ جو لوگ خود اپنے ہی راستے کی دیوار بن کر بیٹھ جاتے ہیں وہ پورے انسانی معاشرے کے بھی دشمن ثابت ہوتے ہیں۔

اس طرزِ عمل کی بنیادی وجہ اسلام کی فکر اور اس کی نتیجہ خیز تعلیمات سے غفلت ہے۔ خودساختہ زندگی کے خول میں بند رہ کر زندگی گزارنے کی روش ہے' جسے دورِ جدید میں روشن خیالی کا نام دیا جارہا ہے۔ درحقیقت یہ روشن خیالی نہیں بلکہ اندھیروں اور لاعلمی کو اپنا مقصدِ حیات بنالینا ہے۔ اسلام کی تعلیمات کا گہرائی میں جاکر مطالعہ کیا جائے تو یہ حقیقت واضح ہوگی کہ اس سے

(باقی صفحہ 118 پر)

حقوق اللہ اور حقوق العباد کا جائزہ

ممتاز ہاشمی

حقوق اللہ اور حقوق العباد کے درمیان ترجیحات کے بارے میں اکثر مختلف خیالات‘ نظریات اور غلط فہمیاں پائی جاتی ہیں۔ اس لیے اس بارے واضح تصور حاصل کرنے کے لیے معاملے کو انتہائی باریکی سے دیکھنے اور سمجھنے کی ضرورت ہے۔ سب سے پہلے تو ہر صاحبِ ایمان کے لیے بنیادی شرط اللہ ربّ العزت کی کامل حاکمیت‘ وحدانیت اور اس کو کائنات کا واحد خالق و مالک تسلیم کرنا ہے۔ اس کامل ایمان کا عملی تقاضا یہ ہے کہ تمام مخلوقات صرف اور صرف اپنے خالق و مالک کے احکامات پر عمل پیرا ہونے کی پابند ہیں۔ اس کے برعکس عمل یعنی اللہ سبحانہ وتعالیٰ کو کائنات کا خالق‘ مالک یا حاکم تسلیم نہ کرنا ایمان کی نفی اور شرک کہلائے گا۔

شرک کے حقیقی تصور کو سمجھنے کے لیے یہ بات ذہن نشین کر لیں کہ دین اسلام کی روح اور اس کی اساس توحید پر قائم ہے۔ اس لیے ہمیں توحید کے اصل معانی کا ادراک حاصل کرنا بہت ضروری ہے۔ توحید کی ضد کو شرک کہا جائے گا‘ جو ”اکبر الکبائر“ (سب سے بڑا گناہ) شمار ہوتا ہے۔ شرک درحقیقت اللہ تعالیٰ کی ذات اور صفات میں کسی کو کسی بھی طرح سے شریک کرنا ہے اور یہ گویا اللہ تعالیٰ کی وحدت کا انکار ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کے حقوق سے انکار اور اس کے دائرہ کار میں مداخلت کے مترادف ہے۔ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے حقوق کو اجمالی طور پر ایک لفظ ”عبادت“ کے ذریعے بیان کیا جا سکتا ہے۔ قرآن حکیم میں واضح طور پر ارشاد ہے:

﴿وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ ﴿٥٦﴾﴾ (الذّٰریٰت)

”میں نے جنات اور انسانوں کو صرف اسی لیے پیدا کیا ہے کہ وہ میری عبادت کریں۔“

عبادت کی اصطلاح کے بارے میں عموماً غلط فہمی پائی جاتی ہے۔ اکثریت اسے صرف نماز‘ روزہ‘ حج‘ زکوٰۃ تک محدود کرتی ہے۔ اگرچہ یہ سب بھی ہمارے دین کا لازمی اور اہم ترین حصّہ

Email:mhashmi100 @gmail.com

ہیں لیکن وہ زندگی کے خاص ادوار/ اوقات تک محدود ہیں۔ لہٰذا انہیں مطلق عبادت نہیں کہا جا سکتا۔ عبادت کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے غلاموں کی طرح زندگی گزارنا اور تمام معاملات میں اللہ کے حکم پر عمل کرنا۔ ہمیں اپنے خالق و مالک کے کچھ مخصوص اَحکام پر عمل پیرا ہونے جبکہ دوسرے اَحکام کی نفی کرنے کی آزادی حاصل نہیں ہے۔

عبادت صرف اس وقت انتہائی قبولیت کا درجہ حاصل کرتی ہے جب یہ اللہ تعالیٰ سے انتہائی محبت کی وجہ سے ہو‘ کسی خوف کی وجہ سے نہ ہو۔ یہاں پر یہ حدیث پیش نظر رکھنا بہت اہم ہے کہ ”اَعمال کا دارومدار نیتوں پر ہے۔“ اللہ تعالیٰ ہماری نیتوں کو اچھی طرح جانتا ہے اور ہمارے تمام اعمال کا تعین ہماری نیتوں کی بنیاد پر ہی کیا جائے گا۔ لہٰذا ہمارے تمام اَعمال کو عبادت کے حقیقی معنی کے مطابق ہونا چاہیے۔ اللہ تعالیٰ کے کچھ اَحکام پر عمل پیرا ہونا اور بقایا سے گریز کرنا ہماری اپنی ذاتی ترجیح اور اپنے نفس کی پسند یا ناپسند کو مدّنظر رکھنا قرار پائے گا۔ گویا ایک طرح سے اپنے نفس کو معبود کا درجہ دے دیا گیا۔ چنانچہ ایسے اَعمال شرک کی آمیزش سے پاک نہیں ہوں گے۔

ریاکاری اور دکھاوے کو اللہ کے رسول ﷺ نے ”شرکِ خفی“ قرار دیا ہے۔ چنانچہ جو اعمال بھی اللہ تعالیٰ کی رضا و خوشنودی کے بجائے لوگوں کو دکھانے کے لیے کیے جائیں وہ سب شرک کے زمرے میں آتے ہیں‘ اگرچہ بظاہر وہ ”اعمالِ صالحہ“ شمار ہوتے ہوں۔ پس حدیثِ نبویؐ کی رو سے دکھاوے کی خاطر نماز پڑھنے والا‘ روزہ رکھنے والا اور خیرات کرنے والا شرک کر رہا ہوتا ہے۔ ہم ایسی کئی چیزوں کا اپنی روزمرہ زندگی کے معاملات میں جائزہ لے سکتے ہیں۔ لازم ہے کہ اپنی اصلاح کی خاطر توبہ واستغفار کے عمل کو جاری وساری رکھا جائے۔

قرآن حکیم میں واضح طور پر بیان کیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ شرک کو تو ہرگز معاف نہیں کرے گا‘ البتہ اس کے سوا دوسرے گناہ جس کے لیے چاہے گا معاف کر دے گا۔ اگر ہم شرک کی اقسام پر توجہ دیں تو اکثر گناہوں کے تانے بانے شرک سے جا ملتے ہیں۔ سب سے بڑا شرک اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی ذات میں کسی کی شراکت قائم کرنے کی کوشش کرنا ہے۔ مسلمان بظاہر اپنے آپ کو شرک سے مبرا سمجھتے ہیں‘ کیونکہ وہ اللہ تعالیٰ پر ایمان کا دعویٰ کرتے ہیں‘ لیکن وہ صرف زبانی حد تک ہوتا ہے جبکہ عملی طور پر اللہ کے احکامات کو نظرانداز کیا جاتا ہے۔ اسی طرح ہم بارہا

اللہ تعالیٰ کے صرف اُن احکامات پر عمل کرتے ہیں جو ہمارے لیے فائدہ مند ہوں' اور جو احکامات ہمارے مفادات کے خلاف ہوں ان کو مکمل طور پر نظرانداز کر دیتے ہیں۔ اس طرح ہم اکثر شرک کا ارتکاب کرتے رہتے ہیں لیکن ہمیں اس کا احساس تک نہیں ہوتا۔

دینِ اسلام میں صرف ان ہی حقوق کو ''حقوق العباد'' کا نام دیا گیا ہے جن کا حکم خود اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے۔ یہ تمام حقوق دراصل ''حقوق اللہ'' ہی کے ذیل میں آتے ہیں۔ ایسا نہیں ہے کہ احکم الحاکمین کے احکامات کی بجائے خود کوئی پیمانہ' معیار یا قوانین وضع کرتے ہوئے ان کو انسانی حقوق یا حقوق العباد کا نام دے دیا جائے۔

اسلامی تعلیمات میں یہ بات بہت واضح ہے کہ حقوق العباد کو اللہ تعالیٰ بھی معاف نہیں کرتا' جب تک کہ متاثرہ شخص کی طرف سے معافی نہ ہو۔ مثلاً آپ نے کسی شخص سے قرض لیا ہوا ہے تو اس کی ادائیگی آپ پر فرض ہے اور یہ صرف توبہ واستغفار سے ساقط نہیں ہوگا۔ حدیث نبویؐ کی رو سے اللہ کے راستے میں شہید ہونے والے کے تمام گناہ معاف ہو جاتے ہیں' سوائے قرض کے۔

اس سلسلے میں یہ بات بھی سمجھنے کی ہے کہ حقوق العباد بھی صرف وہی قابلِ معافی ہیں جو انفرادی سطح پر ایک شخص کے دوسرے شخص سے وابستہ ہیں۔ ان کا معاف کرنا متاثرہ فریق کی مرضی پر منحصر ہے۔ جب کہ ایسے تمام حقوق العباد جن سے معاشرے کے اجتماعی مفادات منسلک ہوتے ہیں' ان میں کوتاہی پورے معاشرے میں انتشار اور فساد فی الارض کا باعث بنتی ہے۔ اس لیے ان کی معافی یا تلافی کسی انفرادی حیثیت سے نہیں ہو سکتی بلکہ اس کے لیے روزِ قیامت ہی حساب کتاب ہوگا' جس کی سنگینی کا تصور بھی مشکل ہے۔

حقوق اللہ اور حقوق العباد کے درمیان ترجیحات کو سمجھنے کے لیے مندرجہ ذیل آیات بہت اہمیت کی حامل ہیں:

﴿قُلْ تَعَالَوْا اَتْلُ مَا حَرَّمَ رَبُّكُمْ عَلَيْكُمْ اَلَّا تُشْرِكُوْا بِهٖ شَيْـًٔا وَّبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا ۚ﴾ (الانعام:۱۵۱)

''کہیے: آؤ میں تمہیں سناؤں کہ تمہارے رب نے تم پر کیا چیزیں حرام کی ہیں۔ (اوّلاً) یہ کہ کسی شے کو اُس کا شریک نہ ٹھہراؤ اور والدین کے ساتھ حسنِ سلوک کرو۔''

یعنی سب سے پہلے تو اللہ تعالیٰ نے اپنے ساتھ شرک کو حرام ٹھہرایا ہے اور دوسرے نمبر پر والدین

کے حقوق میں کوتاہی حرام قرار دی ہے۔ قرآن حکیم میں یہ تیسرا مقام ہے جہاں حقوق اللہ کے فوراً بعد حقوقِ والدین کا تذکرہ آیا ہے۔ اس سے پہلے سورۃ البقرۃ کی آیت ۸۳ اور سورۃ النساء کی آیت ۳۶ میں والدین کے حقوق کا ذکر اللہ تعالیٰ کے حقوق کے فوراً بعد کیا گیا ہے۔ لیکن یہ بات بھی بڑی صراحت کے ساتھ بیان کر دی گئی ہے کہ والدین کے حقوق اللہ تعالیٰ کے حقوق کے تابع ہیں۔ اگر والدین کی اطاعت میں اللہ اور رسول ﷺ کی نافرمانی لازم آ رہی ہو تو والدین کی اطاعت ہرگز نہیں کی جائے گی۔

سورۃ التوبہ کی آیت ۲۴ میں اللہ تعالیٰ نے ایک میزان نصب کر دی ہے' جس کے ایک پلڑے میں علائق دنیوی کی محبت اور دوسرے پلڑے میں اللہ' اُس کے رسول ﷺ اور اُس کے راستے میں جہاد کی محبت کو رکھ کر اندازہ کیا جائے کہ کون سا پلڑا بھاری ہے!

﴿قُلْ اِنْ كَانَ اٰبَآؤُكُمْ وَاَبْنَآؤُكُمْ وَاِخْوَانُكُمْ وَاَزْوَاجُكُمْ وَعَشِيْرَتُكُمْ وَاَمْوَالُ ۨ اقْتَرَفْتُمُوْهَا وَتِجَارَةٌ تَخْشَوْنَ كَسَادَهَا وَمَسٰكِنُ تَرْضَوْنَهَآ اَحَبَّ اِلَيْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَجِهَادٍ فِيْ سَبِيْلِهٖ فَتَرَبَّصُوْا حَتّٰى يَاْتِيَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ ۭ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْفٰسِقِيْنَ ۝﴾ (التوبۃ)

''آپ کہہ دیجیے: اگر تمہارے باپ اور تمہارے بیٹے' تمہارے بھائی اور تمہاری بیویاں' تمہارے کنبے قبیلے اور تمہارے کمائے ہوئے مال اور وہ تجارت جس کی کمی سے تم ڈرتے ہو اور وہ حویلیاں جنہیں تم پسند کرتے ہو (اگر یہ ساری چیزیں) تمہیں اللہ سے اور اُس کے رسول سے اور اُس کی راہ میں جہاد سے زیادہ عزیز ہیں' تو تم انتظار کرو کہ اللہ تعالیٰ اپنا حکم (عذاب) لے آئے۔ اور اللہ تعالیٰ فاسقوں کو ہدایت نہیں دیتا۔''

قرآن حکیم کی روشنی میں یہ بات تو بالکل واضح ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسانوں میں سب سے بڑا حق والدین کے لیے رکھا ہے' تاہم سورۃ التوبہ کی مذکورہ بالا آیت سے یہ بات نکھر کر سامنے آ جاتی ہے کہ حقوق اللہ تمام دوسرے حقوق سے برتر و بالادست ہیں اور دوسرے تمام حقوق ان کے تابع ہیں۔ مخلوق میں سے کسی کا حق بھی اللہ کے حق سے فائق نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو ہدایت عطا کرے تاکہ شرک سے بچ سکیں اور اپنی اصلاح کرتے ہوئے حقوق اللہ اور حقوق العباد کو اس کے حقیقی مفہوم میں ادا کر سکیں۔ آمین!

مکشوفاتِ بُگوی

ڈاکٹر انوار احمد بُگوی صاحب کی تحریر
''ڈاکٹر اسرار احمد بطورِ شاگرد مولانا امین احسن اصلاحیؒ'' پر تبصرہ

از قلم: مکرم محمود

اللہ تعالیٰ نے انسان کو عام طور پر تین ذرائع علم عطا فرمائے ہیں۔ اوّلاً سچی خبر... یعنی جس خبر کو دینے والا الصادق ہو' ثانیاً عقل... یعنی قطعی عقلی مقدمات کی بنیاد پر کچھ نتائج نکالے جائیں اور تیسرا ذریعۂ علم مشاہدہ ہے۔ گویا ایک غیر نبی کے لیے بنائے علم منقولات' معقولات اور مشاہدات ہی قرار دیے جاسکتے ہیں۔ اس کے علاوہ ایک چوتھا ذریعۂ علم کشف والہام بھی ہے جو یقیناً ایک ذریعہ علم تو ہے لیکن اس کی کچھ شرائط ہیں: اس کی بنیاد پر قطعی حکم نہیں لگایا جاسکتا... کسی دوسرے کے لیے وہ حُجت نہیں ہوسکتا... اس کی بنیاد پر فیصلے نہیں کیے جاسکتے' وغیرہ وغیرہ۔ اس ذریعۂ علم کے ضمن میں سب سے اہم نکتہ یہ ہے کہ یہ بھی دیکھا جائے گا کہ صاحبِ کشف والہام کون ہے؟ اس کی شخصیت وکردار کیا ہے؟

صاحبزادہ انوار احمد بگوی صاحب کی تحریر پڑھ کر یہ بات جاننے میں دشواری پیش آرہی تھی کہ اس تحریر کا تعلق منقولات' معقولات اور مشاہدات میں سے کس قبیل سے ہے؟ ان میں سے کسی میں بھی یہ تحریر فٹ بیٹھ کر نہیں دے رہی تھی۔ کافی کوشش کے بعد نتیجہ بہرحال یہ نکلا کہ اس کا تعلق مکشوفات سے ہے۔ صاحبِ تحریر کو علمِ غیب' علمِ وہبی' علمِ لدنی اور علمِ ''اسرار'' سے چونکہ ایک وافر حصّہ (بزعمِ خود) عطائے خداوندی سے حاصل ہوا ہے تو موصوف نے اپنی اس وہبی صلاحیت (جو کہ ظاہر ہے عام انسانوں کو حاصل نہیں ہوتی) کو استعمال کرتے ہوئے کچھ نتائج نکالے ہیں۔ یہ تحریر گویا ان نتائج کا بیان ہے۔ ان نتائج کے لیے انہوں نے تبرعاً' بلکہ احسان کرتے ہوئے کچھ واقعات سے بھی استدلال کیا ہے' لیکن ان واقعات سے اس درجے

کے حاصلات جو اس تحریر میں بیان کیے گئے ہیں کشف والہام کے بغیر ممکن نہیں۔ کمال یہ ہے کہ صاحبِ تحریر نے ہر دعوے کے نتائج و حاصلات پوری قطعیت کے ساتھ شروع میں ہی بیان کر دیے ہیں اور بعد ازاں واقعات اور اپنے ذہنی تانے بانے کو اس کے ثبوت کے طور پر پیش کیا ہے۔ گویا منطقِ استخراجی کو استعمال کرتے ہوئے کلیات کا بیان (نتائج جو نکالے گئے' فیصلے جو سنائے گئے' نیتوں اور ارادوں کا حتمی علم جو اُن کو من جانب اللہ حاصل ہے) پہلے ہوتا ہے اور جزئیات پر ان کا انطباق بعد میں۔ جب پہلے سے طے کرلیا گیا کہ ایک انسان بدنیت ہے' لیڈر بننے کے چکروں میں ہے تو پھر ہر واقعے اور جزیئے پر اس کا انطباق نہایت سہولت کے ساتھ کرتے چلے جانا کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ پوری تحریر کا تجزیہ کرنا تو کارِ طویل اور لاحاصل ہے' چند ایک اقتباسات پیش کر کے ان پر تبصرہ کیا جائے گا جو معاملہ فہم حضرات کے لیے ان شاء اللہ کافی ہوجائے گا۔ العاقل یکفیہ الاشارۃ۔

صاحبِ تحریر نے مضمون کے پہلے ہی صفحہ پر ''کلیہ'' بیان کر دیا ہے اور قولِ فیصل بھی صادر فرما دیا ہے۔ ذرا اقتباس ملاحظہ فرمائیے: ''ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کے اندر ناموری کی طلب اور جماعت سازی کی لٹک تو ابتدا ہی سے تھی' چنانچہ ان کی زندگی اس امر کی غماز ہے کہ دین سے متعلق ان کے ہر کام میں نمود و نمائش اور کاروباری ذہنیت اور منفعت کا پہلو ضرور نظر آئے گا۔''

جب شروع ہی میں یہ حتمی کلام ارشاد فرما کر قاری کا ذہن بنا دیا گیا ہے تو قاری کے لیے معروضی نتائج تک پہنچنا کیونکر ممکن ہوگا؟ مولانا عبدالماجد دریابادیؒ کا قول ''معاصرت کا ابتلاء ایک بڑا ابتلاء ہے'' دراصل اس عربی مقولہ سے ماخوذ ہے کہ ''المعاصرۃ اصل المنافرۃ''۔ یہ کچھ بزرگوں کا قول ہے جو اپنے اندر گہری معنویت رکھتا ہے اور انسانی نفسیات پر ان کی عمیق بصیرت کو ظاہر کرتا ہے۔ بگوی صاحب کا مولانا دریابادی کا یہ قول نقل کرنا ڈاکٹر اسرار صاحبؒ کے حوالے سے تو اتنا سمجھ میں نہیں آرہا مگر بگوی صاحب کی اس تحریر کے مطالعہ کے بعد خود بگوی صاحب پر قرائن کی بنا پر غلبہ ظن کے ساتھ ضرور صادق آتا ہے۔ صاحبزادہ بگوی صاحب ڈاکٹر اسرار احمدؒ کے معاصر ہیں اور ان کے اپنے قول کے مطابق اصلاحی صاحب کے حلقے میں شامل ان کے استاد بھائی بھی۔ ڈاکٹر صاحب رحمہ اللہ کے بارے میں کچھ نتائج اور ''فیصلے'' جس طریقے سے سنائے گئے ہیں اور نیت کو جاننے اور باطن میں جھانکنے کی جو غیر معمولی 'وہبی' مہارت صاحبِ تحریر کو حاصل ہے اس سے معاصرت کی بنا پر منافرت اور حسد ظاہر ہوتا ہے (باطن کا حال تو اللہ ہی جانتا ہے مگر

واقعات اور نیتوں میں تانا بانا جس طریقے سے جوڑا گیا ہے اور باطنی ارادوں اور عزائم کے بارے میں جو categorical statements صادر فرمائی گئی ہیں اس سے تو یہی ظاہر ہوتا ہے۔) کسی کی نفرت دل میں ہو تو اُس کے ہر قول وفعل میں کیڑے نکالنا کوئی کارِ صعب نہیں۔ صاحبزادہ انوار احمد بگوی صاحب کی یہ تحریر ان کی اپنی باطنی کیفیت پر شاہد ہے۔ پہلے سے کچھ نتائج نکال کر واقعات کو ان پر زبردستی منطبق کیا گیا ہے۔ واقعات کو دیکھنے کے یکسر مختلف تناظر بھی ممکن ہی نہیں ناگزیر بھی تھے، لیکن جو پہلے سے طے کر لیا گیا تھا اور جو نتائج وہ نکالنے کا ارادہ کیے بیٹھے تھے اس نے ان کے ''ذہن رسا'' کو کسی اور طرف مائل ہونے ہی نہیں دیا۔ ڈاکٹر صاحبؒ کا خاکہ ''ایک بڑے کینوس پر'' پر جو صاحبزادہ صاحب نے بنایا ہے اس کے جملہ رنگ بگوی صاحب کی کیفیاتِ قلبی کے آئینہ دار ہیں اور ''سٹروکس'' گویا زہر میں بجھے ہوئے تیر ہیں۔

بظاہر صاحبِ تحریر کو علمِ غیب سے وافر حصّہ ''عطا'' ہوا ہے۔ انہی کی منطق کو برتتے ہوئے اور ان کے ''علمِ لدنی'' سے تھوڑا سا مستعار لیتے ہوئے تو یوں بھی کہا جا سکتا ہے کہ ''ان کے استاد بھائی ڈاکٹر اسرار احمد صاحب تو میڈیکل ڈاکٹر ہوتے ہوئے مدرّسِ قرآن، داعیٔ انقلاب اور بابائے عصر کہلائے (ڈاکٹر صاحب کی پیش گوئیوں کی شہرت کی بنا پر سوشل میڈیا پر یہ لقب دیا گیا ہے) جبکہ مولانا اصلاحی ہی کے دوسرے ''شاگردِ رشید'' (یعنی بگوی صاحب) نرے میڈیکل ڈاکٹر اور دوائیاں ڈسپنس کرنے والے فکاہی طرز کے ایک مصنف ہی رہ گئے''۔ بلاشبہ بگوی صاحب کی ہرزہ سرائی اُن کے اپنے حوالے سے اس بات کا ثبوت ہے کہ معاصرت کا ابتلاء ایک بڑا ابتلاء ہے!

ابتدائی حصے سے ایک اور اقتباس ملاحظہ فرمائیں: ''جنرل ضیاء الحق کے ''اسلامی دورِ حکومت'' میں جب انہوں نے میڈیا میں اپنی پہچان پیدا کر لی تو انہوں نے اپنی تگ ودو میں فیصلہ کیا کہ برِصغیر کے دیگر اہلِ علم کی طرح اب ان کے لیے قرآن کا ترجمہ اور تشریح وتفسیر لکھنا ضروری ہے، کیونکہ پہلے تمام تراجم، تفاسیر اور تشریحات ناکافی ثابت ہوئی ہیں۔ یہ ''ضرورت'' ان کو اپنے ''مقاصد'' کی کامیابی کے لیے بہت راس آئی۔'' اسی طرح بگوی صاحب ایک اور جگہ لکھتے ہیں: ''موصوف نے اپنے طور پر تفسیر قرآن لکھنے کا ارادہ کیا۔''

سُبحان اللہ ! سُبحانک ھذا بھتان عظیم! کہتے ہیں کہ کسی کی محبت (یا نفرت) انسان کو اندھا اور بہرا کر دیتی ہے۔ ڈاکٹر صاحبؒ نے تو پورے شرح وبسط کے ساتھ اس کا پس منظر بیان القرآن کے مقدمے میں لکھ دیا ہے۔ ملاحظہ فرمائیے:

''اس دعوتِ قرآنی کا نقطۂ عروج یہ تھا کہ ۱۹۸۴ء (۱۴۰۴ھ) میں نمازِ تراویح کے ساتھ دورۂ ترجمۂ قرآن کا آغاز ہوا۔ چنانچہ ہر چار رکعت تراویح سے قبل ان رکعتوں میں پڑھی جانے والی آیات کا ترجمہ اور مختصر تشریح بیان ہوتی تھی —— پھر نماز میں ان کی سماعت ہوتی تھی، جس کے نتیجے میں، بعض لوگوں میں کم اور بعض میں زیادہ، وہ کیفیت پیدا ہو جاتی تھی جسے اقبال نے اپنے اس شعر میں بیان کیا ہے کہ ؎

ترے ضمیر پہ جب تک نہ ہو نزولِ کتاب
گرہ کشا ہے نہ رازی نہ صاحبِ کشاف!

اس عمل کے نتیجے میں نمازِ عشاء اور نمازِ تراویح کی تکمیل میں لگ بھگ چھ گھنٹے صرف ہوتے تھے —— اور بحمد اللہ سامعین کا جوش وخروش اور ذوق وشوق دیدنی ہوتا تھا اور ثم الحمدللہ کہ اب یہ سلسلہ پاکستان کے بہت سے مقامات پر میری صُلبی اور معنوی اولاد کے ذریعے جاری ہے!

اس سلسلے میں دورۂ ترجمہ کا جو پروگرام ۱۹۹۸ء میں کراچی کی قرآن اکیڈمی کی جامع مسجد میں ہوا اس کی آڈیو ویڈیو ریکارڈنگ اعلیٰ معیار پر کی گئی تھی۔ چنانچہ یہ بحمد اللہ آڈیو ویڈیو کیسٹوں اور C.D.s اور D.V.D.s اور ٹی وی چینلز کے ذریعے پوری دنیا میں نہایت وسیع پیمانے پر پھیل چکا ہے —— اور اب اسے کتابی شکل میں بھی شائع کرنے کا سلسلہ شروع ہو رہا ہے، جس کی پہلی جلد آپ کی خدمت میں حاضر ہے! اس کی طباعت واشاعت کے سلسلے میں انجمن خدام القرآن صوبہ سرحد کے صدر جناب ڈاکٹر اقبال صافی نے تاکید کا جو دباؤ مرکزی انجمن پر برقرار رکھا اور مالی تعاون بھی پیش کیا، اس کی بنا پر اس سے استفادہ کرنے والے ہر شخص پر ان کا یہ حق ہے کہ ان کے لیے دعائے خیر ضرور کریں۔

آخری بات یہ کہ اس ''بیان القرآن'' کے ضمن میں اگر اصحابِ علم میری غلطیوں کی نشاندہی کریں تو میں ممنون ہوں گا —— اور آئندہ طباعت میں تصحیح بھی کر دی جائے گی۔ اس بات کو دہرانے کی چنداں ضرورت نہیں ہے کہ میں نہ مفسّر ہونے کا مدّعی ہوں نہ عالم ہونے کا، بلکہ صرف اللہ کے کلامِ پاک اور اس کے دینِ متین کا ادنیٰ خادم ہوں۔ اور میری سب حضرات سے اِستدعا ہے کہ میرے حق میں دعا کریں کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ میری مساعی کو شرفِ قبول عطا فرمائے اور نجاتِ اُخروی کا ذریعہ بنا دے۔ آمین! یا ربَّ العٰلمین!''

’’تقدیم طبع ثالث‘‘ میں ڈاکٹر صاحبؒ رقم طراز ہیں:

’’بیان القرآن (حصہ اوّل) کے پہلے دو ایڈیشن چند ہی ماہ میں (یعنی دیکھتے ہی دیکھتے!) ’ختم‘ ہو گئے۔ اور یہ بات میرے لیے بہت حیرت انگیز ہے۔ اس لیے کہ میں اوّلاً تو مفسرِ قرآن ہی نہیں ہوں‘ ثانیاً میرا کسی معروف مذہبی فرقے یا مسلک سے کوئی تنظیمی تعلق بھی نہیں ہے‘ ان امور کے علی الرغم اس کی اس قدر پذیرائی یقیناً اللہ تعالیٰ کی کسی خصوصی مشیت کی مظہر ہے —— واللہ اعلم!!

قرآن حکیم کی اس ترجمانی میں اگر کوئی خیر وجود میں آیا ہے تو وہ سراسر اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم سے ہے —— اور خالصتاً اُس کی عطا و مرحمت کا نتیجہ ہے۔ اور اگر کسی مقام پر کوئی غلطی ہوگئی ہے تو وہ سراسر میرے علم یا فہم کا قصور ہے‘ جس کے لیے اللہ تعالیٰ سے بھی عفو ودرگزر کا طلب گار ہوں —— اور اہلِ علم حضرات سے بھی توقع رکھتا ہوں کہ اس پر خالصتاً فرمانِ نبوی ’’اَلدِّیْنُ النَّصِیْحَۃُ‘‘ کے مطابق متنبہ فرما کر ثواب حاصل کریں گے ——! اور ذاتی طور پر مَیں بھی ممنون ہوں گا!!

اس جلد میں ابھی صرف سورۃ الفاتحہ اور سورۃ البقرۃ کی ترجمانی ہوئی ہے‘ گویا کہ ابھی پہاڑ ایسا بھاری کام باقی ہے۔ تاہم اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم سے توقع ہے کہ جیسے اس نے میرے کسی ارادے یا منصوبہ بندی کے بغیر اور میری خالص لاعلمی میں پیش نظر جلد شائع کرا دی‘ ویسے ہی باقی بھی شائع کرا دے گا — خواہ خود میری اس دنیا سے دارِ آخرت کی جانب روانگی کے بعد ہی سہی — آخر میں دعا ہے: اللّٰھم تقبل منی فانک خیرُ المُتقبِّلین وتُب عَلَیَّ فانک انت التوّابُ الرّحیم! اٰمین! یاربّ العٰلمین!!‘‘

متذکرہ بالا طبع شدہ تصریحات کی روشنی میں بگوی صاحب سے پوچھنا بنتا ہے کہ یہ کہاں مذکور ہے کہ ڈاکٹر صاحبؒ نے قرآن کے ترجمہ اور تفسیر وتشریح لکھنے کا کوئی بیڑا اٹھایا تھا۔ ڈاکٹر صاحبؒ نے اپنے اس عزم کا اظہار کب اور کہاں پر کیا ہے؟ یہ بھی آپ کے ’’علومِ وہبیہ‘‘ میں سے ہی ہے یا نرا سوئے ظن ہے؟ کیا کہیں زبانی یا تحریری طور پر ڈاکٹر صاحبؒ نے یہ بات کی ہے کہ پہلے تراجم‘ تفاسیر اور تشریحات ناکافی ثابت ہوئی ہیں؟ ڈاکٹر صاحبؒ نے بہت موقعوں پر صراحت کے ساتھ کہا ہے کہ میں مفسر قرآن نہیں ہوں بلکہ قرآن کا ایک ادنیٰ طالب علم ہوں۔ حضرت کچھ انصاف کا معاملہ فرمائیے۔ آپ کو خوب معلوم تھا کہ ’’بیان القرآن‘‘ کی اشاعت کا

آغاز بغیر ڈاکٹر صاحبؒ کی کسی منصوبہ بندی کے بلکہ لاعلمی میں ہوا۔ ڈاکٹر صاحبؒ نے احساسِ فرض کے تحت عمومی درسِ قرآن کی تحریک برپا کی تھی تاکہ عوام کا تعلق قرآن سے جوڑا جائے اور تجدیدِ ایمان کی صورت ہو سکے۔

بگوی صاحب ایک اور جگہ فرماتے ہیں: ’’اسرار احمد کے اندر شروع سے جماعت سازی اور نمایاں رہنے کا شوق رہا ہے‘‘۔ ماشاء اللہ! ڈاکٹر صاحب ابھی گویا بچے ہی تھے کہ بگوی صاحب کو ان کے ’’اشواق‘‘ اور ’’مقاصد‘‘ کا حتمی علم حاصل ہو گیا تھا۔ یاللعجب!

جماعت میں پیدا ہونے والے اختلافات اور ماچھی گوٹ کے واقعہ کا ذکر کرتے ہوئے بگوی صاحب کا اندازِ تحریر ملاحظہ فرمائیں: ’’ظاہر ہے کہ جب اختلاف کا یہ سانحہ رونما ہوا تو اس میں جماعت کے اکابرین اور ممتاز اہل علم شامل تھے جو اس کے بانیوں میں سے تھے۔ ان اصحاب کے ساتھ ان کے شاگرد پیشہ یا خوشہ چین جوان بھی ہم نوا تھے‘ جن میں اسلامی جمعیت طلبہ کے سابق ناظم اعلیٰ ڈاکٹر اسرار احمد صاحب بھی شامل تھے۔ ان بزرگوں کے مشاہدات‘ تصریحات اور ان کی اختلافی آواز کو یقیناً ایک بڑا وزن حاصل ہے۔ ان اصحاب کے جانے سے جماعت کا گراف یکبارگی علمی‘ تحریکی اور نظریاتی طور پر نیچے آیا۔ ان آوازوں میں ایک آواز اور بھی شامل ہو جاتی ہے‘ جیسے ایک بنک کے مشہور اشتہار میں پہلے گھر کے بڑے اسے اپنا بنک قرار دیتے ہیں‘ پھر ایک ننھی سی باریک آواز کسی بچے کی آتی ہے کہ ’’میلا بھی بنک‘‘ یہ ننھی سی آواز ایک نوجوان اسرار احمد کی تھی جو اکابرین کی صدا میں اپنی آواز کو پورے جوش سے شامل کر رہے تھے کہ میں بھی پانچ سواروں میں! قافلہ حریت میں شمولیت اعزاز تھی مگر بعد ازاں اس کا کریڈٹ لینا محض تعلّی اور خودستائشی ہے۔ جیسے ڈاکٹر اسرار احمد کے شعور‘ اظہار اور استعفاء سے جماعت کی لٹیا ڈوب گئی۔‘‘ انا للہ وانا الیہ راجعون!

بلاشبہ بشری کمزوریوں کی وجہ سے انسان کچھ واقعات کو بیان کرتے ہوئے جوش میں آ کر مبالغہ بھی کر جاتا ہے۔ اس امکان کا انکار نہیں کیا جا سکتا۔ مگر ذرا اس بات کی طرف التفات فرمائیں کہ بگوی صاحب کس خوبصورتی سے ’’میلا بھی بنک‘‘ اور ’’ننھی سی آواز‘‘ کے پردے میں دو سو صفحات کی اس پوری کتاب یعنی ’’تحریک جماعت اسلامی: ایک تحقیقی مطالعہ‘‘ کا ذکر گول کر گئے‘ جس کتاب کا ایک غالب حصہ ڈاکٹر صاحبؒ نے کافی وقت لے کر ماچھی گوٹ کے اجلاس میں پڑھ کر سنایا تھا۔ یہ تو ایک حقیقی واقعہ ہے جس کے عینی گواہ اس اجلاس کے جملہ

حاضرین تھے۔ یہ ٹھیک ہے کہ ڈاکٹر صاحبؒ اپنے علمی مقام و مرتبہ اور عمر میں بعض دوسرے اصحاب سے جونیئر تھے' مگر کہاں ''ایک ننھی سی آواز'' اور کہاں ایک تحقیقی کتاب' جسے بعض اصحابِ علم و معروف اکابرین کی تائید و تصویب سے امیر جماعت اور اراکینِ شوریٰ کے سامنے پڑھ کر بھی سنایا گیا۔ بگوی صاحب! انصاف کا خون کرنا اسی کو کہتے ہیں۔

ایک اقتباس میں بگوی صاحب فرماتے ہیں: ''تفسیر کی ابتدائی چند جلدیں چھپنے کے بعد ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کا مولانا اصلاحیؒ کے توسط سے اندرونِ ملک اور بیرونِ ملک خصوصاً ہندوستان میں اہلِ علم اور اہلِ خیر سے وسیع تعارف اور تعلق استوار ہوا۔ان کے دل میں جماعت سازی کی لٹک تو پہلے روز سے موجزن تھی......'' جماعت سازی کی لٹک کو تو بگوی صاحب نے اپنے ''وہبی علم'' کی بدولت دل میں جھانک کر موجزن دیکھ لیا' لیکن اس حقیقت کا ذکر بالکل گول کر گئے کہ ڈاکٹر صاحبؒ سورۃ النور تک پہنچنے کے بعد مزید طباعت سے کیوں دست کش ہو گئے؟ قارئین کی معلومات کے لیے ہم عرض کیے دیتے ہیں۔ ہوا یہ تھا کہ سورۃ النور کی تفسیر میں حدِ رجم کے مسئلہ میں اصلاحی صاحب نے جمہور اُمت سے اختلاف کیا تو اکٹر صاحبؒ نے مزید تعاون سے دستبرداری اختیار کر لی۔ چنانچہ بعد ازاں یہ ''نیک کام'' ماجد خاور صاحب نے اپنے ذمے لے لیا۔

بگوی صاحب ایک اور جگہ لکھتے ہیں: ''اپنی شرحِ قرآن بنام ''بیان القرآن''، اپنا منتخب کاکٹیل نصاب درس اور اپنی تقریر میں تفسیر تدبرِ قرآن سے ایک ذہین مگر شاطر شاگرد کی طرح خوب خوب استفادہ کیا ہے مگر اب کسی اعتراف اور احسان کے بغیر مولانا اصلاحی کے فیضان یا احسان کا بھولے سے بھی ذکر نہیں کیا۔''

مطالعہ قرآن حکیم کے منتخب نصاب کو ''کاکٹیل نصابِ درس'' قرار دے کر بگوی صاحب اپنے تئیں کچھ ''لدنی معارف'' ظاہر فرمانا چاہتے ہوں گے لیکن اس طرح وہ قرآن حکیم کی توہین کے مرتکب ہوئے ہیں۔ مزید برآں کیا وہ یہ بھول گئے کہ اس زہر میں بجھے ہوئے تیر کی زد خود اُن کے اور ڈاکٹر صاحبؒ کے مشترک استاد مولانا اصلاحی صاحبؒ پر پڑتی ہے! واقعہ یہ ہے کہ جسے بگوی صاحب ''کاکٹیل نصاب'' قرار دے رہے ہیں وہ دراصل مولانا اصلاحیؒ کا ترتیب دیا ہوا ہے جس میں کچھ قرآنی مقامات کا اضافہ ڈاکٹر صاحبؒ کا کیا ہوا ہے۔ ؎

ناوک نے تیرے صید نہ چھوڑا زمانے میں
تڑپے ہے مرغِ قبلہ نما آشیانے میں

جہاں تک معاملہ ''شرحِ قرآن'' کا ہے تو جنابِ محترم یہ ۱۹۹۸ء کے رمضان المبارک کا وہ دورۂ ترجمۂ قرآن ہے جس کا اسّی فیصد (یعنی سوائے پہلی جلد کے باقی سارا حصّہ) ڈاکٹر صاحبؒ کی وفات کے بعد ٹرانسکرائب کرا کر چھاپا گیا ہے۔ (نوٹ: بیان القرآن کی پہلی جلد پر لکھا ڈاکٹر صاحبؒ کا مقدمہ پڑھنے کے لائق ہے' جس سے بگوی صاحب کے بہت سے اعتراضات رفع ہو جاتے' اگر وہ انصاف پسندی کا مظاہرہ کرتے۔) حیرت کی بات یہ ہے کہ مضمون کے آخر میں بگوی صاحب نے بقلم خود ڈاکٹر صاحبؒ کا ایک اقتباس نقل کیا ہے جس میں ڈاکٹر صاحبؒ مولانا اصلاحیؒ کے علمی مقام کی تعریف و توصیف یوں فرماتے ہیں:

> ''مولانا صاحب کی تفسیر ''تدبرِ قرآن'' بلاشبہ بہت اعلیٰ پائے کی تفسیر ہے۔ اس میں انہوں نے ''نظام القرآن'' کے حوالے سے اپنے استاد حمید الدین فراہیؒ کے کام کو آگے بڑھایا ہے۔ مَیں نے ذاتی طور پر اس تفسیر سے بہت استفادہ کیا ہے' لیکن مجھے مولانا سے بہت سی باتوں میں اختلاف بھی تھا۔ مَیں سمجھتا ہوں کہ رجم کی سزا سے متعلق رائے دینے میں ان سے بہت بڑی خطا ہوئی ہے۔ (وضاحت کے لیے ملاحظہ ہو سورۃ النور' تشریح آیت ۲)۔ اللہ تعالیٰ انہیں معاف فرمائے۔ مولانا کا ذکر ہوا ہے تو ان کے لیے دعا بھی کیجیے: اَللّٰھُمَّ اغْفِرْلَہٗ وَارْحَمْہُ وَاَدْخِلْہُ فِیْ رَحْمَتِکَ وَحَاسِبْہُ حِسَاباً یَسِیْرًا۔ اَللّٰھُمَّ نَوِّرْ مَرْقَدَہٗ وَاَکْرِمْ مَنْزِلَہٗ وَاَلْحِقْہُ بِعِبَادِکَ الصَّالِحِیْنَ۔ آمین یا ربَّ العالَمِین!

''بیان القرآن'' کے اس اقتباس میں مولانا اصلاحی صاحبؒ کے حوالے سے کی گئی گفتگو ملاحظہ فرمائیے اور پھر دیکھیے بگوی صاحب کا یہ فرمانا کہ ''کسی اعتراف اور احسان کے بغیر مولانا اصلاحیؒ کے فیضان یا احسان کا بھولے سے بھی ذکر نہیں کیا'' اور پھر آخر میں خود ہی ڈاکٹر صاحبؒ کا مذکورہ بالا اقتباس بھی نقل کر دیا۔ سبحان اللہ! کیا کھلا تضاد ہے بگوی صاحب کا۔

بگوی صاحب نے یہ دعویٰ بلا دلیل بھی کیا ہے کہ ''ڈاکٹر صاحب کا بیانیہ دینی اور تہذیبی کسی اعتبار سے بھی پاکستان کے معاشرے پر کوئی دیر پا اثر نہیں چھوڑ سکا''۔ بگوی صاحب سے پوچھنا بنتا ہے کہ دیر پا اثر سے کیا مراد ہے اور اُن کے خیال میں کس نے دیر پا اثر چھوڑا ہے؟ جہاں تک ڈاکٹر صاحب رحمہ اللہ کا معاملہ ہے' ان کی دینی خدمات کے اثرات کی فہرست طویل ہے' میں صرف دو اثرات کا ذکر کرتا ہوں:

(۱) دورۂ ترجمہ قرآن: یہ ''مستحسن'' ''بدعت'' ڈاکٹر صاحب کی ہی شروع کی ہوئی ہے اور اب

تقریباً تمام مکاتب فکر کے لوگ خلاصۂ مضامین یا دورۂ قرآن مجید رمضان المبارک کے مہینے میں کرواتے ہیں۔ قرآن حکیم کے علوم و معارف اور تذکیر بالقرآن کی جانب پڑھے لکھے لوگوں اور عوام الناس کے متوجہ ہونے میں یقیناً ڈاکٹر صاحبؒ کی سعی و جُہد کا بڑا حصّہ ہے۔ اس کے ''متاثرین'' اب لاکھوں نہیں کروڑوں میں ہیں۔

(۲) شادی بیاہ سے متعلق اصلاحِ رسوم کی تحریک: سُنّت کے مطابق مسجد میں نکاح کی محفل' برات اور جہیز وغیرہ کے طوق اور اغلال سے نجات' بامعنی انداز میں خطبہ نکاح اب کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں رہی۔ اس تحریک کا اثر بھی بحمد اللہ بڑے پیمانے پر ہوا ہے۔

آخر میں عرض یہ ہے کہ بگوی صاحب کی پوری تحریر میں سے چند اقتباسات ''مشتے از خروارے'' کے طور پر پیش کیے گئے ہیں۔ باقی مکشوفات کو بھی انہیں پر قیاس کر لیجیے۔ ہمارے اس مختصر مضمون کے لب و لہجہ میں تیکھے پن کی وجہ بگوی صاحب کا اسلوبِ نگارش ہے۔ ان کی اداؤں نے جو ہمیں گھائل کیا ہے تو اس کے بعد یہ پیشکش ہی ممکن تھی —— ع ''یہ ہی ممکن تھا اتنی عجلت میں!'' بگوی صاحب نے جس طرح کا سوقیانہ انداز اپنایا ہے اور جس طرح کے حتمی فیصلے صادر فرمائے ہیں اس کے جواب میں ہم نے شاید 'ہاتھ ہولا' ہی رکھا ہے۔ لغزش کا صدور تو تمام انسانوں سے ہوتا ہے' یقیناً ڈاکٹر صاحبؒ سے بھی ہوا ہوگا۔ اگر سیدھے طریقے سے باتوں کی نشان دہی کر دی جاتی اور اتنے عظیم اور حتمی نتائج نہ نکالے جاتے تو بگوی صاحب کے حق میں بہتر ہوتا۔ مضمون کا جو مرکزی مسئلہ ہے جس کے لیے ایک طولانی تمہید باندھی گئی ہے وہ سورۃ الحج کی آیت ۵ کی تشریح و تفسیر ہے۔ ''بیان القرآن'' کو تحریر کے قالب میں ڈھالنے والے ایڈیٹرز اگر مولانا اصلاحی صاحبؒ کا نام اس جگہ سے حذف کر دیتے تو بہتر تھا' مگر اس سے بگوی صاحب نے جو کچھ برآمد کرنے کی کوشش کی ہے وہ صریح زیادتی' بہتان اور سوئے ظن ہے۔ صاف نظر آتا ہے کہ بعض مزعومہ مفروضوں کی روشنی میں یہ تحریر سپردِ قلم کی گئی ہے۔ واضح رہے کہ اگر ڈاکٹر صاحبؒ نے مولانا سے اپنے اختلاف کا ذکر کیا ہے اور بطور مثال رجم کی سزا کو بیان کیا ہے تو کیا یہ ڈاکٹر صاحب کی شاذ رائے ہے؟ اس نکتے پر ڈاکٹر صاحبؒ کا تو ذکر ہی کیا' تمام مفسّرین کو اصلاحی صاحب سے اختلاف ہے۔ نیز ڈاکٹر صاحبؒ نے اپنے مفسّر ہونے کا بارہا انکار کیا ہے۔ نہ تو ڈاکٹر صاحبؒ نے کبھی عالم دین ہونے کا دعویٰ کیا ہے اور نہ ہی اپنے آپ کو مودودی صاحبؒ

یا اصلاحی صاحبؒ کے بالمقابل رکھا ہے' بلکہ ان دونوں حضرات سے اپنے اخذ و استفادہ کا وہ مستقل ذکر کرتے رہے ہیں۔ آخر میں اس آیت پر بات ختم کرتا ہوں:

﴿یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْا قَوّٰمِیْنَ لِلّٰهِ شُهَدَآءَ بِالْقِسْطِ ۫ وَ لَا یَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰۤى اَلَّا تَعْدِلُوْا ؕ اِعْدِلُوْا ۫ هُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى ۫ وَ اتَّقُوا اللّٰهَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ خَبِیْرٌۢ بِمَا تَعْمَلُوْنَ ۝۸﴾

''اے ایمان والو! انصاف کے ساتھ گواہی دیتے ہوئے اللہ کے حکم پر خوب قائم ہو جاؤ اور تمہیں کسی قوم کی عداوت اس پر نہ اُبھارے کہ تم انصاف نہ کرو' (بلکہ) انصاف کرو' یہ پرہیزگاری کے زیادہ قریب ہے' اور اللہ سے ڈرو۔ بے شک اللہ تمہارے تمام اعمال سے باخبر ہے۔''

❀❀❀

بقیہ: عرضِ احوال

رفقاءِ محترم! ایسے میں اپنی دنیا سنوارنے' پاکستان کو ناقابلِ تسخیر بنانے اور آخرت میں کامیاب ہونے کا صرف اور صرف ایک ہی طریقہ ہے' اور وہ یہ کہ اقامتِ دین کی جدّوجُہد میں عملاً اپنا تن من دھن لگا دیں۔ اب محض باتوں سے کام نہیں چلے گا۔ پانی سر سے گزرنے کو ہے۔ فیصلہ کیجیے: دل یا شکم؟ اس سالانہ اجتماع میں صف بستہ ہو کر' دیگر رفقاء کے ساتھ کندھے سے کندھا ملا کر اس عہد کو تازہ کریں کہ میرے رب نے اقامتِ دین کی جدّوجُہد کا جو فریضہ مجھ پر عائد کیا ہے' اُسے اپنے دُنیوی اُمور پر ترجیح دوں گا۔ جس قدر ہو سکا' دین کی دعوت خاص و عام تک پہنچاؤں گا اور ایسے مثالی نظم کا مظاہرہ کروں گا کہ حکم ملنے پر قدم بڑھاؤں اور حکم ملنے پر رُک جاؤں۔ اقامتِ دین کی جدّوجُہد میں اپنی ذمہ داریاں احسن طریقے سے نبھانے والے لوگ یقیناً دنیا کے خوش قسمت ترین لوگ ہیں۔ اے ربّ العزت! ہم سب کو اپنا عہد نبھانے کی توفیق عطا فرما اور عہد شکنی کی لعنت سے محفوظ فرما۔ آمین یا ربّ العالمین! ❀❀❀

اطلاع برائے قارئین	قارئین نوٹ فرمالیں کہ پیشِ نظر شمارہ کی حیثیت نومبر دسمبر کے مشترکہ اشاعت کی ہے!

سوال نامہ برائے قارئین ''میثاق''

براہ کرم دیے گئے سوالات کے جواب (✔) لگا کر دیں۔ جہاں تفصیلی جواب کی ضرورت محسوس کریں' علیحدہ صفحہ پر تحریر کریں۔

(۱) کیا آپ ماہنامہ ''میثاق'' باقاعدگی سے خریدتے ہیں؟

ہاں ☐ نہیں ☐

(۲) کیا آپ ماہنامہ ''میثاق'' کے تمام مضامین کا مطالعہ کرتے ہیں؟

ہاں ☐ نہیں ☐

۳۔ کیا آپ ماہنامہ ''میثاق'' کا جزوی مطالعہ کرتے ہیں؟

ہاں ☐ نہیں ☐

(۴) آپ نے ماہنامہ ''میثاق'' کے گزشتہ 12 ماہ کے کن مضامین کو:

	☐ دلچسپی سے پڑھا	☐ بار بار پڑھا	☐ دوسروں کو پڑھایا
i)	______	______	______
ii)	______	______	______
iii)	______	______	______

اگر ان کی تعداد زیادہ ہے تو تفصیل الگ صفحہ پر لکھیں۔

(۵) کیا آپ نے ماہنامہ ''میثاق'' کے ادارۂ تحریر کو کبھی بذریعہ خط/ای میل کوئی رائے' تجویز یا مشورہ دیا ہے؟

ہاں ☐ نہیں ☐

(۶) براہِ راست رابطے کی صورت میں کیا ادارہ کی جانب سے آپ کے خط کا تسلی بخش جواب دیا گیا؟

ہاں ☐ نہیں ☐

(۷) آپ ماہنامہ ''میثاق'' میں مزید کن موضوعات پر تحریروں کا اضافہ چاہتے ہیں' جس سے اس کی افادیت بڑھ سکے؟

____

____

____

(۸) کیا آپ ماہنامہ ''میثاق'' خرید کر پڑھتے ہیں یا آن لائن مطالعہ پر اکتفا کرتے ہیں؟

خرید کر ☐ آن لائن ☐

(۹) کیا آپ اپنے حلقہ احباب کو ماہنامہ ''میثاق'' پڑھنے کی ترغیب دیتے ہیں؟

ہاں ☐ نہیں ☐

(۱۰) آپ دوسرے معروف دینی جرائد کے مقابلے میں ''میثاق'' کو کون سا درجہ دینا پسند کریں گے؟

سب سے بہترین ☐ بہتر ☐ مناسب ☐

(۱۱) کیا ماہنامہ ''میثاق'' میں انگریزی زبان میں بھی مضمون شامل ہونا چاہیے؟

ہاں ☐ نہیں ☐

مندرجہ بالا کے علاوہ بھی اگر ماہنامہ ''میثاق'' کو بہتر بنانے اور اس کے قارئین کی تعداد میں اضافہ کے حوالے سے آپ تجاویز دینا چاہیں تو انہیں علیحدہ کاغذ پر لکھ کر بھیج دیں۔

والسلام

مدیر ماہنامہ ''میثاق''

شعبہ مطبوعات' قرآن اکیڈمی' 36-K ماڈل ٹاؤن لاہور 54700

Email:publications@tanzeem.org

Nov 2023
Vol.72

Regd. CPL No.115
No.11

Monthly **Meesaq** Lahore

﴿لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ﴾ (الاحزاب:21)

تنظیمِ اسلامی
کا سالانہ
کُل پاکستان اجتماع

17 18 19 نومبر 2023ء

(بروز جمعہ، ہفتہ، اتوار) آغازِ اجتماع: نمازِ عصر (3:45)

بمقام مرکزی اجتماع گاہ، بہاولپور

منعقد ہو رہا ہے (ان شاء اللہ العزیز)

عَنْ مُعَاذِ بْنِ جَبَلٍ ؓ قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ يَقُوْلُ: قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰى:

((وَجَبَتْ مَحَبَّتِيْ لِلْمُتَحَابِّيْنَ فِيَّ وَالْمُتَجَالِسِيْنَ فِيَّ وَالْمُتَزَاوِرِيْنَ فِيَّ وَالْمُتَبَاذِلِيْنَ فِيَّ))

[رواہ مالک واحمد والطبرانی والحاکم]

معاذ بن جبل ؓ فرماتے ہیں کہ مَیں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا کہ اللہ تبارک وتعالیٰ فرماتے ہیں:
''میری محبت لازم ہوگئی اُن کے لیے جو میری خاطر ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں اور مل کر بیٹھتے ہیں اور ایک دوسرے کی زیارت کو جاتے ہیں اور ایک دوسرے پر مال خرچ کرتے ہیں۔''

لہٰذا رضائے الٰہی کے حصول کے لیے
بیعت سمع وطاعت کے مسنون معاہدہ میں منسلک رفقاء کو شرکت کی بھرپور دعوت ہے۔

تفصیلات کے لیے اپنے مقامی نظم سے رجوع کیجیے!

المعلن: ناظمِ اعلیٰ، تنظیمِ اسلامی فون: 78-(042)35473375